علی اکبر ناطق

قائم دین

افسانے

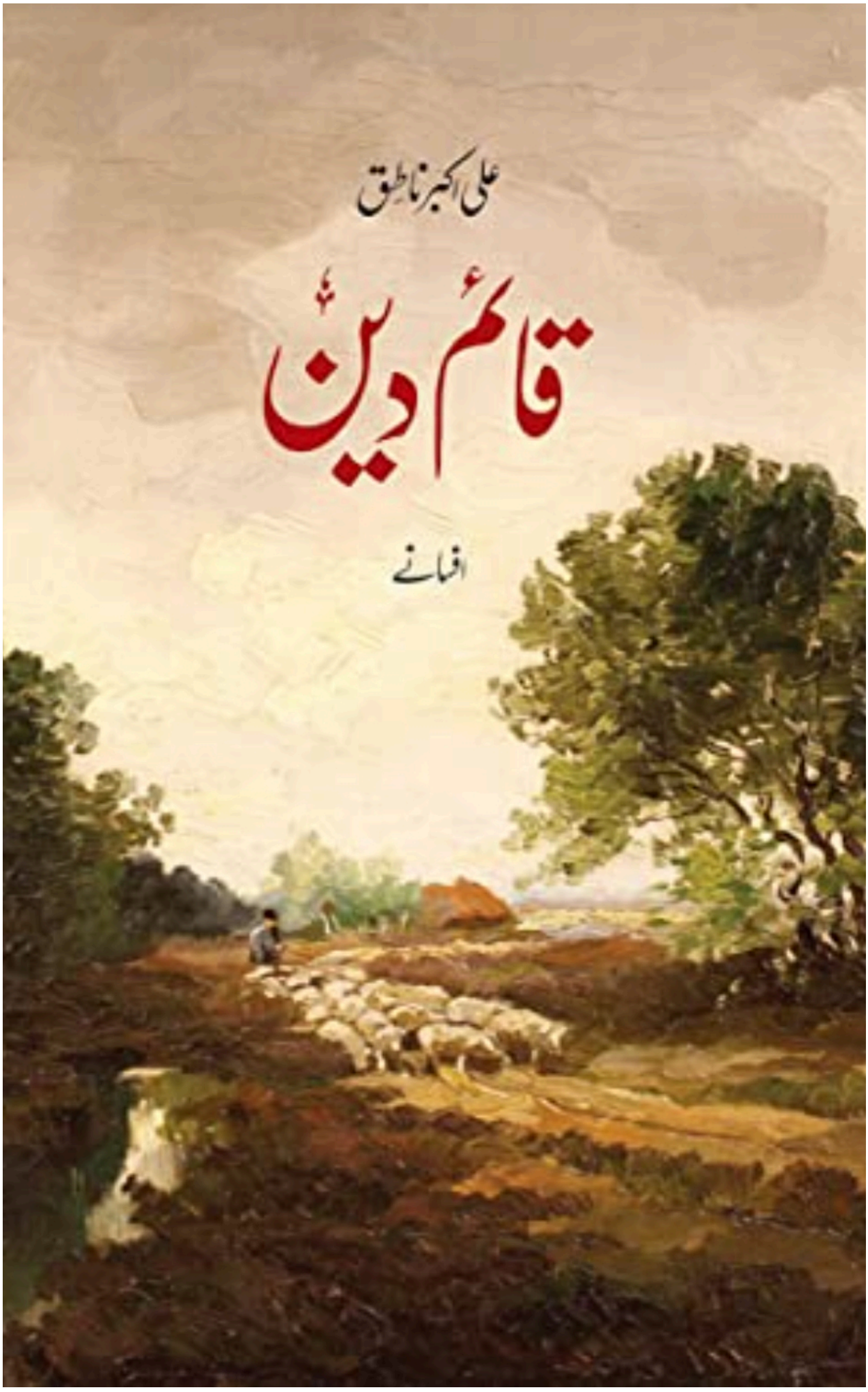

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

قائم دین

(افسانے)

علی اکبر ناطق

قائم دین

فہرست

انتساب ..... ث

پیش لفظ ..... ج

شریکا ۱

شاہ مدار کی پازیبیں ۷

بیچارگی ۱۶

قائم دین ۲۲

تابوت ۳۴

شہابو خلیفہ کا شک ۴۰

جودھ پور کی حد ۵۰

کمی بھائی ۵۵

نرینہ اولاد ۶۳

معمار کے ہاتھ ۶۷

اچھو بازی گر ۸۰

مومن والا کا سفر ۸۵

والٹر کا دوست ۹۱

شیدے نے پگڑی باندھ لی ۹۸

مولوی کی کرامت ۱۰۲

انتساب

اپنے چھوٹے بھائی علی اصغر کے نام

جو جواں سال فوت ہو گیا۔

پیش لفظ

میں نہیں جانتا پیش لفظ کیسے لکھے جاتے ہیں۔ اپنے افسانوں کے متعلق صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے کسی بھی قسم کے فلسفے یا نظریے سے قطع نظر، فقط حقیقی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ یہ فیصلہ قاری خوب کر سکتا ہے۔ جہاں تک افسانے کے فن اور تکنیک کا تعلق ہے، میں اس سے بھی واقف نہیں۔ فقط افسانے اور ناول پڑھتا رہا ہوں اور ادب کا ایک ادنیٰ قاری ہوں جس کو اپنے ناقص مطالعے کا خوب علم ہے۔ یہ میرا پہلا مجموعہ ہے جسے ایک بڑے اشاعتی ادارے سے چھپنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔

شکریے کے طور پر میں سب سے پہلے اجمل کمال، مدیر آج کا نام لوں گا جس نے میرے افسانہ نگار ہونے کی پہلی گواہی دی اور پھر میں نے مزید حوصلہ پکڑا۔ اس کے بعد آصف فرخی نے مجھے اپنے رسالے **دنیازاد** میں چھاپا۔ اور پھر فہمیدہ ریاض، شمس الرحمٰن فاروقی، افتخار عارف، منظر نقوی اور قاسم یعقوب نے میری خوب پذیرائی کی۔ میں اس کے لیے ان سب کا شکر گزار ہوں۔ اور اب قارئین سے درخواست کروں گا کہ وہ میرے حق میں دعا کریں کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔

علی اکبر ناطق

شریکا

''یہ سکھڑا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ حرامزادہ سؤر کی طرح اکڑ کے چلتا ہے، اوپر سے گھورتا بھی ہے۔'' شوکا اس وقت غصے میں تھا۔

''شوکے! ذرا تحمل سے کام لو اور ٹھنڈے دل سے سوچو،'' دارا بولا۔

''دارے خاں! اب صبر نہیں ہوتا۔ بات حد سے نکل گئی،'' جاگیرے نے اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''آخر یہ عاقل خاں ہماری ساری برادری سے طاقتور تو نہیں؟ کل کھوہ سے آتے ہوئے ٹانگیں توڑ دو۔''

''لیکن...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں،'' غفارے نے دارے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہم اتنے بے غیرت بھی نہیں ہوئے کہ عاقل خاں دن دیہاڑے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالے۔ اور اب تو بات کیوں کے منہ میں بھی آ گئی ہے۔''

ڈیرے میں بیٹھا ہر شخص آج طیش میں تھا، اس لیے بات دارے کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑائی ہو اور بات آس پاس کے گاؤں میں بھی پھیل جائے، مگر رات کے بارہ بجے ایک فیصلہ ہو گیا۔

سردار نتھا سنگھ کی قلعہ نما حویلی گاؤں کے مرکز میں تھی، جس میں سکھوں کے پچاس گھر آباد تھے جن کی اکثریت زمینداروں کی تھی۔ گاؤں میں زمین تو چودھری سردار محمد عرف دارے خاں اور سردار احمد بخش کی بھی کافی تھی، لیکن رعب داب نتھا سنگھ کا ہی تھا۔ سکھ مسلمان کا تعصب بالکل نہیں تھا۔ گاؤں والے دکھ درد کے ساجھے اور صدیوں سے ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ الغرض، زندگی امن سے چل رہی تھی کہ اچانک تقسیم کا عذاب آ پڑا۔ ساری فاختائیں اڑ گئیں۔ نتھا سنگھ کو بھی حویلی چھوڑنا پڑی۔ چھکڑوں پر سامان لد گیا اور سارا قبیلہ لدھیانے کے لیے بیل گاڑیوں پر سوار ہو گیا۔ چلنے سے پہلے افراد گنے گئے تو معلوم ہوا کہ شیر سنگھ غائب ہے۔ ہزار ڈھونڈا مگر پتہ نہ چلا۔ آخر کار نذیرے تیلی نے خبر دی۔

''سردار جی! شیر سنگھ مسجد میں بیٹھا مولوی جان محمد سے کلمہ پڑھ رہا ہے۔''

یہ سن کر سردار جی کے ہوش اڑ گئے۔ خبر دھوئیں کی طرح اٹھی تو مائی دھیراں نے دوہتڑ پیٹا اور بین کرنے لگی۔ نتھا سنگھ نے جلدی سے دلبیر کو بھیجا کہ بھائی کو لے کے آئے۔ اس نے لاکھ منتیں کیں مگر اس کو نہ آنا تھا، نہ آیا۔

قافلہ تین دن رکا رہا۔ مائی باپو نے کیا کیا نہ سمجھایا، مگر شیر سنگھ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کیس کٹوا، کڑا کرپان نتھا سنگھ کے منہ پر ماری اور مُسلا ہونے کا اعلان کر دیا۔ آخر سردار جی نے بیٹے کی ہٹ دھرمی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ حویلی کی چابیوں کے علاوہ سوا یکڑ زمین کے کاغذات بھی اس کے حوالے کیے، روتی پیٹتی دھیراں کے ساتھ باقی اولاد کو لیا اور لدھیانہ چلا گیا۔

اِدھر گاؤں میں شادیانے بجنے لگے۔ مولوی جان محمد نے شیر سنگھ کا نام عاقل خاں رکھ دیا کہ اس نے مسلمان ہو کر بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ دوزخ اور ہجرت دونوں سے بچا۔

نتھا سنگھ کی حویلی جو اب عاقل خاں کے پاس تھی، اس کی دیوار دارے خاں کے چھوٹے بھائی جمال دین کے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ شیداں اسی جمال دین کی بیٹی، ناک نقشے کی درست، بے باک طبیعت کی مالک تھی۔ اِدھر یہ بیس سال کا خوبصورت جوان تھا، لہٰذا کبھی یہ دیوار سے اُدھر، کبھی وہ دیوار سے اِدھر۔ تقسیم کو تین سال ہو گئے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یوں آرام سے نبھ رہی تھی کہ ایک دن عاقل خاں نے جانے کیا سوچ کر جمال دین سے رشتہ مانگ لیا۔ اس وقت چودھری بدکے اور انھیں معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ فوراً انکار کر دیا بلکہ لین دین بھی ختم کیا۔ اس نے بڑا زور مارا لیکن کوئی بس نہ چلا۔ لاکھ زمینوں والا سہی، آخر تھا تو سکھ کا بیٹا۔ چودھری رشتہ دے کر زمانے کو کیا منہ دکھاتے۔

بالآخر شیداں دارے خاں کے بیٹے شوکے سے بیاہ دی گئی۔ مگر یہ بھی نچلا نہ بیٹھا، برابر ملتا رہا۔ پانچ سال ہونے کو آئے، اُس کے دو بچے ہو گئے، مگر اِدھر وہی جذبہ، بلکہ اب تو احتیاط بھی کچھ باقی نہ رہی اور بات دور تک نکل گئی۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہنے لگے کہ بچے شوکت سے نہیں، عاقل خاں سے ہیں۔

شوکے نے شیداں کو لاکھ مارا پیٹا، کئی دفعہ عاقل خاں کو بھی دھمکایا، لیکن نتیجہ سوائے بدنامی کے کچھ نہ نکلا۔ کئی دفعہ چودھریوں کی نیت بدلی مگر عملی کارروائی نہ کر سکے۔ اس طرح کچھ وقت اور گزر گیا۔ آخر چودھری کہاں تک برداشت کرتے، اس لیے انھیں اب حتمی فیصلہ کرنا پڑا۔

وہ کھوہ پر پہنچا تو شبیرا بھینسوں کو چارا ڈال رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوی، جس کا دستہ چھ فٹ لمبے بانس کا تھا، شریہہ کے تنے کے ساتھ لگا دی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے سوچا، میں بھی کوئی بزدل نہیں، آدھ

سیر دیسی گھی تو میری ایک دن کی خوراک ہے۔ گاؤں میں بس یہ شبیرا ہی ایک ایسا ہے جو میرے مقابلے کا ہے۔ لیکن یہ بھی میرا ہی آدمی ہے۔ ویسے بھی جب یہ فیروز پور سے آیا تھا تو میں نے ہی اس کی مدد کی، رہنے کو اپنے کھوہ پر جگہ دی۔ آج سات سال ہو گئے، میری ہی زمین کاشت کرتا ہے۔

اس نے سوچا، یہ بھی اچھا ہی ہوا جو شبیرا میرے پاس ہی چلا آیا۔ گاؤں میں کوئی تو ایسا ہے جو میرا اپنا ہے۔ انھی خیالوں میں گم تھا کہ شبیرا پاس آ بیٹھا۔ شبیرے کو دیکھ کر عاقل خاں اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر عاقل خاں کی طرف دیکھتے ہوئے شبیرا بولا، ''بھائی عاقل خاں، آج کل چودھریوں کے تیور ٹھیک نظر نہیں آتے۔''

''لگتا مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟'' عاقل خاں اٹھتے ہوئے بولا۔

''کرنا کیا ہے؟ میں تو کہتا ہوں، شیداں کا پیچھا اب چھوڑ ہی دے۔ کہیں کوئی نقصان نہ ہو جائے،'' شبیرے نے دھیمے سے کہا۔

''شبیرے، یہ نہیں ہو سکتا!'' عاقل خاں بولا۔

''آخر کیوں نہیں ہو سکتا؟'' شبیرے نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اسی بیچاری کی خاطر تو میں نے واہگرو سے بے وفائی کی، دین دھرم بدلا اور ساری برادری سے لعنتیں لے کر مسلا ہوا۔ جب سارا قبیلہ لدھیانے چلا گیا تو میں نے اسی کی خاطر گاؤں نہ چھوڑا اور شیر سنگھ سے عاقل خاں بنا، بے بے روتی پیٹتی چلی گئی۔''

کچھ دیر رک کر بولا، ''پھر تو بھی تو میرے ساتھ ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ دو شیر سنبھالنے مشکل ہیں۔''

شبیرا یہ سن کر کچھ دیر چپ رہا۔ پھر کہنے لگا، ''بھائی عاقل خاں، ٹھیک ہے میں تیرے ساتھ ہوں۔ آخر تجھے بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ لیکن پھر بھی احتیاط سے۔''

جب آٹھ دس دن فیصلے کو ہو گئے اور چودھریوں کی طرف سے کوئی کارروائی نہ ہوئی تو عاقل خاں پھر حوصلے میں آ گیا۔ دوسرا غضب یہ ہوا کہ سردار احمد بخش نے پیغام بھیج دیا، جس کا دارے خاں سے شریکا تھا۔

''عاقل خاں، کوئی بات نہیں۔ حوصلہ رکھنا۔ ہم تیرے ساتھ ہیں۔ آخر سردار نتھا سنگھ کو میں نے بھائی کہا تھا۔ آج اس کے بیٹے کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں گا۔''

ان باتوں سے عاقل خاں پہلے سے بھی شیر ہو گیا اور کھل کھیلنے لگا، پھر بات یہاں تک پہنچی کہ چودھریوں کے محلے سے گزرتے ہوئے اونچی اونچی کھانستا اور طرح طرح کے آوازے بھی کسنے لگا۔

''سن دے سی گے، میدان لگناوا۔ پر چپ چاندی ہوگئی آ۔ ہیا! شیراں نال میدان لانے کوئی سوکھی گل آ۔ پن سیری کلیجہ چاہی دا، پن سیری۔''

آج نو چندی تھی۔ گاؤں کی غریب عورتیں اور بچے عاقل خاں کے کھوہ پر جمع تھے۔ عاقل خاں بھینسوں کا دودھ ان میں تقسیم کرنے لگا۔ ہر نو چندی کو دودھ تقسیم کرنے کی رسم اس کے دادے سردار موہن سنگھ سے چلی آتی تھی۔ جب شام کا جھٹپٹا سا ہو گیا، عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو عاقل خاں کچھ دیر بیٹھ کر حقہ پیتا رہا، پھر ایک ہاتھ میں اپنی چھوی اور دوسرے میں کتیا کی زنجیر پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے شبیرے کو آواز دی (آج اس نے رہٹ چلایا ہوا تھا)۔

''لے شبیرے، رب راکھا، میں چلیا۔ تو اج کماد نوں پانی لا کے سونا۔''

شبیرے نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

اندھیرا چھا چکا تھا۔ وہ بے فکری سے چلتا ہوا جیسے ہی چودھریوں کے محلے کے نکڑ پر پہنچا، کچھ جوانوں نے راستہ روک لیا۔

شوکا سب سے آگے تھا۔ اس نے کہا، ''لے عاقل خاں! ہم نے آج پن سیری کلیجہ کر لیا اور میدان میں بھی آ گئے۔ تو سنبھل لے۔''

عاقل خاں ایک دفعہ تو گھبرا گیا لیکن جلد ہی خود کو سنبھالا۔ کتیا کی زنجیر کھول دی اور چھوی کو مضبوطی سے پکڑ کر ڈٹ گیا۔

ڈانگوں اور چھویوں کا مینہ برسنے لگا۔ عاقل خاں بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ ڈانگوں کے کھڑکنے کی آواز دور تک سنائی دینے لگی جس کی دھمک شبیرے کے کان میں بھی جا پڑی۔ اس نے سوچا، ہو نہ ہو، چودھری عاقل خاں سے بھڑ گئے ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنی ڈانگ پکڑی اور امداد کو بھاگا۔

لڑائی تو دو منٹ میں ہی ختم ہو جاتی، مگر عاقل خاں کی کتیا غضب کی نکلی، اچھل اچھل کر چودھریوں کو کاٹنے لگی۔ ادھر عاقل خاں کے ساڑھے چھ فٹ قد اور لمبے دستے والی چھوی نے بھی بڑا کام کیا، دو تین چودھری زخمی کر کے گرا دیے، مگر کہاں تک۔ آخر پانچ منٹ بعد ہی عاقل خاں بھی گر گیا۔ شبیرا پہنچا تو چودھری جا چکے تھے، باقی خلقت موجود تھی۔ شبیرا چودھریوں کو گالیاں دیتے ہوئے جب عاقل خاں کے نزدیک آیا اور اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اٹھ نہ سکا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں اور کتیا پاس کھڑی زخمی حالت میں شدت سے بھونک رہی تھی۔

خیر، دس بجے کے قریب شبیرے نے عاقل خاں کو شہر کے ہسپتال پہنچایا۔ علاج شروع ہو گیا۔ دوسرے دن رپٹ درج کرا دی اور مقدمہ چل پڑا۔

ادھر شبیرے کی توجہ اور گھی دودھ کی بدولت عاقل خاں کے زخم جلد ہی بھرنے لگے، یہاں تک کہ چند ماہ میں ہی دوبارہ چلنے پھرنے لگا مگر ٹانگوں میں ایک لنگ سا پیدا ہو گیا کہ دور سے ہی عیب ظاہر ہو جاتا تھا۔ یعنی وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ پھر بھی اس نے بددلی ظاہر نہ ہونے دی اور بجائے پیدل چلنے کے گھوڑے پر بیٹھ کر کھوہ پر آنے جانے لگا۔

دوسری طرف چودھریوں نے ٹانگیں تو توڑ دیں مگر شبیرے اور احمد بخش نے انھیں کیس میں ایسا الجھایا کہ جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ مقدمہ طول پکڑ گیا حتیٰ کہ سالوں لمبا ہو گیا۔ ادھر رفتہ رفتہ عاقل خاں کا عشق بھی سرد پڑ گیا، کیونکہ ایک تو جسم میں وہ تاب نہ رہی اور دوسرا مقدمے کے الجھاوے نے توجہ بانٹ دی۔ مگر ایک کسک سی دل میں اب بھی باقی تھی۔

پھر ایک دن کچھ لوگوں نے دونوں پارٹیوں میں صلح کرا دی، جس میں چودھریوں کو کچھ تاوان پڑ گیا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ نہ جانے کیوں عاقل خاں اب بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ بات بھی کم کم ہی

کرتا۔ بڑی دفعہ شبیرے نے حوصلہ بھی دیا مگر اس پر ایک اداسی چھائی رہتی۔ اب وہ رات کو اکثر گاؤں آنے کے بجائے شبیرے کے پاس کھوہ پر ہی رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی چپکے سے رو بھی لیتا۔ اس طرح کئی سال مزید گزر گئے۔ آخر ایک دن شبیرے سے کہنے لگا، ''شبیرے! کچھ دنوں سے بے بے بہت یاد آ رہی ہے۔ اس کا جاتے وقت کا روتا ہوا چہرہ آنکھوں سے نہیں ہٹتا۔ جانے کیوں، آج میرا دل کرتا ہے، پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ اب تو کئی سال خط آئے کو بھی ہو گئے۔ پتہ نہیں چھوٹی جیناں کا کیا حال ہوگا۔ بختاں ماری بیاہ دی گئی ہوگی۔ جانے لگی تو میری ٹانگوں سے چمٹ گئی کہ ویرے کو ساتھ لے کر جاؤں گی... واہگرو کی سونہہ، رات کو نیند نہیں آتی۔''

کچھ دیر رک کر آنسو پونچھتے ہوئے پھر بولا، ''شبیرے! کوئی سب کچھ مجھ سے لے لے، پر مجھے باپو اور بے بے تک پہنچا دے۔''

عاقل خاں کی باتیں سن کر شبیرے کے بھی آنسو نکل آئے۔ اسے بھی اپنے ماں باپ یاد آ گئے جو اٹھارہ سال پہلے فیروز پور سے آتے ہوئے بلوے میں مارے گئے تھے۔

پھر ایک دن عاقل خاں نے تحصیل جا کر دس ایکڑ زمین شبیرے کے نام کر دی اور لدھیانے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ عاقل خاں اپنی زمین بیچ کر لدھیانے جانا چاہتا ہے۔ بات جونہی احمد بخش کے کان تک پہنچی، اس نے زمین خریدنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اتنی اچھی اور رئے کی زمین ہاتھ آنے کا اس سے اچھا اور سستا موقع پھر نہیں آئے گا۔ اس نے عاقل خاں سے کہا، ''عاقل خاں! سردار نتھا سنگھ میرا بھائی بنا تھا اس لیے پہلا حق میرا ہے۔'' خیر، عاقل خاں احمد بخش کے ہاتھ زمین بیچنے کو تیار ہو گیا۔ ادھر چودھریوں کو پتہ چلا تو وہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ احمد بخش کا عاقل خاں سے زمین خریدنا انھیں بالکل گوارا نہ تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ عاقل خاں دارے خاں کو زمین کبھی نہ دیتا۔ یہ دارے خاں کو بھی پتہ تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد تو مسجد کے دروازے پر اس زمین کے معاملے میں چودھری دارے خاں اور احمد بخش کے درمیان کافی لے دے بھی ہوئی اور دارے خاں نے احمد بخش کو یہاں تک دھمکی دے دی کہ تُو ہمیں نہیں جانتا، شریکے کے معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ زمین ہماری زمینوں کے ساتھ پڑتی ہے، اس لیے زمین اگر خریدیں گے تو ہم ہی۔ اس پر سردار احمد بخش تمسخرانہ انداز میں ہنسا اور آگے بڑھ گیا۔ دوسرے دن احمد بخش رقم اور گواہ لے کر تحصیل پہنچ گیا کہ شام اس کے ساتھ عاقل خاں کی بات پکی ہو گئی تھی، لیکن اس نے دیکھا کہ دارے خاں کچھ آدمیوں کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا اور پھر یہ سن کر تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا کہ عاقل خاں نے کچھ ہی دیر پہلے زمین دارے خاں کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ احمد بخش نے عاقل خاں کی طرف مڑ کر بگڑتے ہوئے پوچھا، ''یہ تو نے کیا کیا، تجھے حیا نہ آئی؟''

اس پر عاقل خاں نے سر جھکا کر کہا، ''چاچا احمد بخش! رات دارے خاں کے ساتھ وہ آئی تھی — اب تو ہی بتا، میں شیداں کی بات کیسے ٹال دیتا؟''

شاہ مدار کی پازیبیں

''شاباش مونگیا، شاباش! مار ایک چونچ اور۔ پھڑکا دے اسی جگہ دُم کیلیے کو۔ واہ، ارے واہ وا، بہت ترے کی! مار ایک اور۔ ہا آ، واہ بھئی واہ!''

جوں جوں مرغوں کی لڑائی میں تیزی آتی گئی، بابے چراغ دین کی آواز بلند ہوتے لگی۔ سینکڑوں آدمی ہوں گے کہ ارد گرد جمگھٹا تھا۔ ہر چونچ کی ضرب پر داد کے ڈونگرے برستے۔ ''ارے واہ، شاباش، کاٹ دے کلغی، پھاڑ دے پوٹا!'' کی آوازیں کان بہرے کیے دے رہی تھیں۔

ادھر شریلے لٹھ باز نے جب اپنے مرغ کو پٹتے دیکھا تو تماشائیوں کے ساتھ اپنے مرغ کو بھی کوسنے لگا۔ ''او حرام کے پٹھے، گھر پھونک دیا تیرے باداموں کے عوض۔ بیوی میکے بھیج دی۔ اور تُو نے مُنہ کالا کروا دیا۔ بہت ترے حرام خور کی! اللہ قسم، آج ذبح کر کے نہ کھایا تو شریفا لٹھ باز نہیں۔''

لیکن مرغ نہ اٹھا۔ جب چونچوں پہ چونچیں کھانے لگا تو بابا چراغ دین نے آگے بڑھ کر اپنا مونگیا پکڑ لیا، جس کی اپنی کلغی بھی خون میں نہا رہی تھی۔ اچھے نے شریلے کو دلاسا دیا اور اس کا مرغ اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا، جسے لے کر وہ چپکے سے نکل گیا۔

ادھر پورے کا پورا مجمع چراغ دین کے گھر میں جمع ہو گیا، اور لگے دور دور کی ہانکنے۔

''میں نہ کہتا تھا، مونگیے کی رگوں میں جلالی خون ہے۔ خدا کی قسم دو منٹ اور نہ پکڑتے تو پٹا پھاڑ دیتا۔''

''بھئی، چونچ میں کاٹ تو ذوالفقار ایسی ہے۔ مخالف کو تو گویا کافر سمجھ کے لیتا ہے۔ خدا اسلامت رکھے، بیسیوں لڑائیاں لڑیں اور برابر عزت رکھی۔''

''میاں، مونگیا کوئی ایسا ویسا مرغ تھوڑی ہے۔ لکڑ دادا نے جب واجد علی شاہ کا دربار چھوڑا تو وہاں سے ایک مرغ ہی ساتھ لیا تھا۔ مونگیا اسی کی نسل سے تو چلا آتا ہے۔'' بابے چراغ دین نے آرام سے کلغی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجمعے کو مخاطب کیا۔

پھر تمام لوگ رشک سے اسے دیکھنے لگے۔ آدھی رات تک وہاں مرغ بازی، بٹیر بازی اور کبوتر بازی پر ہی گفتگو رہی، اور گڑ کے میٹھے چاولوں کی ضیافت بھی۔

گاؤں میں یہ واحد ایسا گھر تھا جسے آپ پورے گاؤں کا گھر کہہ سکتے ہیں۔ دو کنال کا کھلا احاطہ، جس کے چاروں طرف دیوار نہیں تھی بلکہ کانٹے دار لکڑیوں کی باڑھ کر دی گئی تھی تا کہ ملکیت کا پتہ چلتا رہے۔ اندر تین چار کمرے ہوں گے جن کی دیواریں گارے مٹی کی اور چھتیں گھاس پھوس کی تھیں۔ سردیاں آتیں تو بھینسیں بھی انھیں کمروں کے اندر بندھتیں۔ میں نے بابا چراغ دین کو کبھی کام کرتے نہیں دیکھا۔ جب بھی احاطے میں داخل ہوا، پہلے سیدھی نظر اسی پر رکتی۔ بڑی کلغی کا ایک اصیل مرغ گود میں ہوتا۔

چراغ دین کے اوپر نیچے چھ بیٹے تھے، جو باپ کے نقشِ قدم پر پورے پورے چلے۔ انھوں نے گھر کو چڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ سینکڑوں کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے پھرتے۔ ہر جھونپڑے کی چھت پر چار چار کبوتر اتارنے کی چھتریاں۔ جدھر دیکھو کنالیاں پڑی ہیں جن کے اندر کبوتروں کا دانہ پانی سوکھتا رہتا۔ ادھر اُدھر بیسیوں کابکیں لٹک رہی ہوتیں اور ایک سے بڑھ کر ایک بٹیریں۔ شیشم کے پیڑ گھنا سایہ کیے رکھتے۔ گھر کے پہلو سے نالا گزرتا جہاں سے سہ پہر کو خوب چھڑکاؤ کیا جاتا۔ درختوں کے سائے میں جب ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے تو بھیگی مٹی کی خوشبو دماغ میں اترتی چلی جاتی۔ سائے اتنے گہرے تھے جیسے سیاہ بادل امڈے ہوں۔

دن بھر جو چاہتا چلا آتا۔ حقہ پیتا، گپیں ہانکتا اور اٹھ جاتا۔ اجازت کیسی؟ جب دیکھو، بیس بیس لوگوں کا مجمع لگا ہے۔ کبوتر بازی اور کنکوّے پر بحث چھڑی ہے۔ گھر کاہے کو، ایک ڈیرہ کہہ لیجیے۔

چھ کے چھ بھائی صبح پانچ بجے اٹھتے۔ نو بجے تک، چار گھنٹے ریت ڈھونے والی ٹریکٹر ٹرالی پر مزدوری کرتے، جو دریا سے شہر میں ریت لے کر جاتیں۔ نو بجے سے لے کر دن بارہ بجے تک بھینسوں کا چارا تیار کر لیتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ دن کا بقیہ حصہ کھیل دھندوں اور کبوتر بازی میں نکلتا۔

میں چونکہ ان کا پڑوسی تھا، دیوار سے دیوار ملی تھی، اس لیے اکثر اُدھر ہی رہتا۔ بارہ ٹہنی، اڈّی کھڈی، شطرنج، کون سی گیم ہے جو ان سے نہیں سیکھی۔ ہاں تاش سے انھیں نفرت تھی، نہ جانے کیوں۔ یہ عمر بھر مجھے بھی نہ آئی۔

دن میں بیسیوں مرتبہ آپس میں لڑتے۔

''دیکھ، میں نے کہہ دیا نا! میرے کالسرے (کبوتر کا نام) کو ہاتھ نہ لگا، ورنہ سر پھوڑ دوں گا۔''

''ہاں، دیکھا میں نے تجھے۔ آیا کہیں نادر شاہ کا نطفہ! کالسرے کا تُو کیا لگتا ہے؟''

''میں کہتا ہوں تو مجھ سے ابھی قتل ہو جائے گا! (اپنی ماں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے) مائی، جیدے کو سمجھا لے، ورنہ سمجھ لینا کہ تو نے ایک جنا ہی نہیں۔''

مائی چراغن نے بھی گالیاں دینی شروع کر دیں، اور ایک سے بڑھ کر ایک تیز۔ ادھر یہ کلہاڑیاں اور درانتیاں اٹھا کر مقابل آ گئے۔ بس پھر کیا، پورا گھر دو حصوں میں بٹ جاتا۔ بابا چراغ دین بھی ایک

کے گدی پر مارتا، کبھی دوسرے کے دھول جماتا اور آخر تھک کر بیٹھ رہتا۔ مگر یہ ہیں کہ چھوٹ چھوٹ پڑتے۔ گالیوں کا شور اس قدر بلند اٹھتا کہ پل میں سارا گاؤں ان کے گھر ہوتا۔ کوئی ایک کو پکڑتا ہے کوئی دوسرے کو۔ بڑی مشکل سے چھوٹ چھٹا ہوتا۔ مگر اس سارے دنگے میں مجال ہے جو ایک چھڑی بھی کسی کو لگ جائے۔ خیر، ابھی تو یہ عالم تھا اور ابھی پھر کنکوے پر بحث جاری ہے۔

شروع شروع میں تو لوگ گھبرا جاتے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ ان کی لڑائی سے لطف لینے لگے۔ سچ پوچھیے تو اب وہ انتظار میں رہتے کہ دیکھیں کب تماشا لگتا ہے۔

لو بھائی، میرے بھی حیف ہے۔ میں نے ان کے نام تو ابھی بتائے ہی نہیں۔ وارث، جو سب سے بڑا تھا، کوئی بھی کام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے نیچے صادق عرف صادھا اور نیچے آیئے تو گاگڑ۔ اس کا اصلی نام مجھے بھی یاد نہیں۔ چوتھے درجے پر جمیل، اس کا بھی اصلی نام خدا جانتا ہے۔ پانچواں ارشد عرف اچھا اور جیدا (جاوید) چھٹا ہوا۔ پہلے تینوں شادی شدہ، اور میں نے ان گنہگار آنکھوں سے تینوں کو بیویوں سے پٹتے دیکھا۔ دو چار دفعہ نہیں، یہ روز کا معمول تھا۔ گاگڑ جسم میں تو ہاتھی تھا مگر جب بیوی جھاڑو پکڑتی تو یہ دوسرے بھائیوں کی پناہ میں دوڑا آتا۔

گرمی اور جاڑے میں یہ آج تک امتیاز نہ کر سکے۔ جون جولائی کی دھوپ ہو یا کڑاکے کی سردی، لباس میں تبدیلی یا پاؤں میں جوتے کبھی نہ رکھے۔ لباس کیا، ایک دھوتی اور کرتا۔ اس سے آگے اللہ ہی اللہ۔ اس معاملے میں باپ بیٹوں کا دستور ایک ہی تھا۔

ہر فرد، چودھری سے لے کر مصلّی تک، برابر ان کا دوست تھا۔ بارہا میں نے دیکھا، کوئی دو فرد آپس میں لڑے تو یہ آدھے ایک طرف ہو گئے اور آدھے دوسری طرف۔ خود بھی مخالف پارٹیوں کی طرف سے ہو کر لڑنے لگے۔ یہ ترکیب ایسی کامیاب رہتی کہ لڑائی لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ ہمارے گاؤں میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جو ان سے بڑھ کر مفلس ہو، مگر یہ ہیں کہ تمام گاؤں کو اپنے سے زیادہ مفلس جانتے ہیں۔ سردی کا موسم نعمت تھا۔ دیسی سرسوں کا ساگ، جو وسطی پنجاب کے دیہاتوں میں عام ہوتا ہے اور بلا قیمت حاصل ہونے والی سبزی ہے، قریب قریب چار ماہ بلا ناغہ پکتا۔ جب دیکھو چولہے پر ہنڈیا چڑھی ہے۔ اس کے ساتھ روٹی کا تکلف بھی کم ہی کرتے۔ بس صبح، دوپہر، شام ساگ کھائے جاتے ہیں اور گنے چوستے ہیں، کہ اس علاقے میں یہ بھی عام اور مفت ہیں۔ گرمی کا موسم ان پہ اگرچہ مشکل گزرتا، مگر کسی نہ کسی زمیندار سے ایک کنال زمین لے کر سبزیاں اگا لیں اور تمام گرمیاں گزار دیں۔

کوئی مانگنے والا آیا تو کمال نیازمندی سے ایک دوسرے کو کہتے، دو یار اسے، بیچارا غریب ہے، اور اٹھا کر کچھ دے دیتے، یوں کہ حاتم کے سر پر جوتے۔ سونے کے لیے کھلے صحن اور تاروں کی چھاؤں میں چارپائیاں لگ جاتیں۔ پھر آدھی رات تک ایسے ایسے بول اٹھاتے کہ مزہ ہی تو آ جاتا۔

پانی چک کے جاندے نارے نی، لگ لوے بلارے
تینوں سدوا یار غلاما تے کھڑی ہو کے گل سُن جا

غرض دوہے، ٹپے اور ہیر وارث شاہ ایسے سُر میں پڑھتے کہ واہ کہتے ہی بنتی۔ ادھر ایک بھائی نے دوہا بولا، دوسرے نے گرہ لگائی۔ دور کی نکڑ میں پڑی چارپائی پر لیٹے ہوئے تیسرے نے اگلا مصرع اٹھا دیا، اور دوہا مکمل۔ باپ سمیت ساتوں ایک کے بعد ایک دوہے اور ٹپے اونچی آواز میں بولتے اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں پڑے سنتے۔

چور اچکے ان کی وجہ سے گاؤں میں آتے ہوئے ڈرتے۔ ذرا کوئی آدمی بازار سے گزرا نہیں کہ انھوں نے چور چور کا شور مچایا۔ لیجیے، اب تو گاؤں کے مُردے بھی جاگ اٹھے اور چور کو بھاگتے ہی بنی۔

کبوتر باز چاہے ولی ہو مگر ایک عیب ان میں ضرور ہوتا ہے، اور یہ ایک عیب ہزار عیبوں کی جڑ، کہ جا و بے جا دیواریں پھلانگتے پھرنا۔ اس میں اچھے کو کمال حاصل تھا۔ چار میل پرا اڑتا کبوتر بھی اس کی نگاہ سے نہ بچتا۔ بس ایک دفعہ نظر آنے کی دیر ہے، پھر تو یہ جا وہ جا۔ آخر پکڑا جاتا، چاہے دشمن کی دیوار پر کیوں نہ بیٹھا ہو۔ اس معاملے میں بہت دفعہ سُبکی بھی ہوئی۔ سردار نبی احمد سیال کی بیوی صحن میں چارپائی کھڑی کر کے اور اس کی ایک طرف سے اوٹ لے کر نہا رہی تھی کہ اچھا ایک کبوتر کے تعاقب میں دیوار پھلانگ کر سیدھا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ وہ بیچاری کپڑے ڈھونڈتی رہ گئی اور یہ چارپائی کے پائے پر بیٹھے کبوتر کو دبوچ کر ابھی قدموں واپس دوڑا آیا، جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ شام کے وقت خوب ہنگامہ ہوا۔ دونوں طرف سے لاٹھیاں نکل آئیں، مگر حاجی لطیف نے بیچ پڑ کر معاملہ دبا دیا اور معافی شافی سے بات ختم ہوئی۔ اسی طرح بہت دفعہ پنچایتیں ہوئیں مگر یہاں عادت کی مجبوری، کہ ایک بار کبوتر پکڑنا ضرور ہے۔ جس دن آسمان صاف اور نیلا ہوتا، جو گاؤں میں اکثر ہوتا ہے، اس دن تو دو چار کبوتر ضرور پکڑے آتے۔

یوں تو کون سا قصبہ یا دیہات ہے جو کبوتر بازی سے ماورا ہے، مگر جیسا شوق اس کا ہمارے علاقے میں تھا، اودھ میں کہاں ہوگا۔ خاص کر چراغ دین کا گھر تو اس واسطے موزوں ترین تھا۔ ہمارا گاؤں جس کے اردگرد تیس پینتیس گاؤں اور تھے، ان میں کوئی پانچ سو کے لگ بھگ کبوتر باز ہوگا، جو ہمارے گاؤں کے سکول میں ہر سال پندرہ جون کو اپنے اپنے کبوتروں کے ساتھ جمع ہو جاتے۔ سکول کی بڑی گراؤنڈ، جو پانچ ایکڑ پر محیط تھی، اس کام کے واسطے جگہ قرار پاتی۔ صبح آٹھ بجے شرطیں بندھ جاتیں اور کبوتروں کی پالیاں فضا میں بلند ہو جاتیں۔

کالسرے، چٹے، چینے، غلوے، جونسرے، دُم چیرے، ڈبے، اَتّے اور نہ جانے کن کن نسلوں کے رنگ برنگے ہزاروں کبوتر آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں حسین رنگ بکھیر دیتے۔ آسمان ایک دلہن کی طرح نکھر جاتا۔ پتہ نہیں اس دن گرمی کی شدت کہاں چلی جاتی۔ ننگے پاؤں دوڑتے پھرتے۔ کبوتر باز تو ایک طرف کہ وہ تو اپنے کبوتروں کا پیچھا کرنے کے لیے دوڑتے ہی تھے، خود ہم لڑکے بالے جس کبوتر میں دلچسپی لیتے اسے دیکھنے کے لیے کوسوں فاصلہ بغیر تھکے طے کر جاتے۔ اس کے علاوہ کبوتر بازوں کے چٹکلے۔

''دیکھ خان محمد، تیرا ڈبا بیٹیں کر رہا ہے۔ زمین پر ابھی آیا کہ آیا،'' اچھے نے کہا۔

''جا لنڈورے، اپنا کام کر۔ پانچ من بادام کھلائے ہیں، زمین پر آنے والا نہیں۔ آسمان پر جائے گا آسمان پر۔ تُو اپنے جونسرے کی خبر لے۔ اس کی دُم خدا کی طرف ہو گئی،'' خان محمد آنکھ میڑھی کر کے بولا، ''ابھی آدھ گھنٹے میں قصہ فیصل ہو جائے گا۔''

دوسری طرف سے شفیع چبوترے والا بولا، ''خان محمد، یہ ڈبا تو نرا مرغی کی نسل سے ہے، تیرے بادام تو آج حلال کرنے سے رہا۔ البتہ چاقو میں لے آیا ہوں۔ یہ لے، گرتے ہی اس کے پھیر دینا۔''

''ہاں دیکھا ہے میں نے تیرے غلوے کو۔ کبوتر کا ہے کو، بطخ پال رکھی ہے بطخ۔ دیکھ تو سہی، ایسے اڑ رہا ہے جیسے تپ دق کا مریض ہو۔''

ادھر شیدا مصری نے ہانک لگائی (اس کی جیب میں ہر وقت مصری ہوتی)، ''ابا کی قسم، کبوتر نہیں، ہمارا کالسرا شکرا ہے شکرا! دیکھو تو، ہر چکر میں پندرہ فٹ اوپر نکل جاتا ہے۔ نیچے اڑنا تو اس کے لیے شرم کی بات ہے۔''

''ہاں، اللہ میاں سے کچھ دنیاوی معاملات طے کرنے جارہا ہے!'' جیمل نے ایک طرف سے پھبتی کس دی۔ ''دیکھنا ایک نہیں بجے گا اور یہ زمین چاٹ لے گا۔''

اِدھر تو یہ نوک جھونک جاری، اُدھر حمید امرائی ڈھول بجائے جاتا ہے۔ کچھ لونڈوں کا اس کے گرد حلقہ جما ہے۔ سارے دن کی گہما گہمی عید کا سماں باندھ دیتی (ہائے وہ دن کیا ہوئے!)۔ الغرض دن کا نصف حصہ تو انھی لطیفوں میں گزرتا اور داد کے ڈونگرے برستے، مگر ایک بجے کے بعد کبوتروں کے ساتھ کبوتر بازوں کے چہروں کا رنگ بھی اڑنا شروع ہوجاتا۔ جس کا کبوتر بیٹھ جاتا وہ کبوتر باز بھی بیٹھ جاتا۔ پھر تو ایک کے بعد ایک، کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا والی صورتِ حال پیدا ہوجاتی۔ نعروں اور پٹاخوں کی گونج کان پھاڑ دیتی، گویا ہمارے گاؤں میں جنگ کا ہنگامہ ہو۔ ایسے حالات میں اچھے اور جیمل کا نیلے پروں والا فضاؤں کو عقاب کے جذبے سے چیرتا دکھائی دیتا۔ آخر کوئی چھ بجے منتیں کر کے اتارتے۔ شام میٹھے چاولوں کی دیگیں پکتیں اور بازی کے جیتے ہوئے پیسے اُدھر نکل جاتے۔ یہ ویسے کے ویسے، کہ مال جس راہ سے آیا تھا اسی راہ نکل گیا۔ پچھلے کئی برسوں سے یہی معمول تھا۔

چودھری لطیف اپنے بیٹوں کے ساتھ لندن گیا تو اس نے اپنی چھ ایکڑ زمین اچھے کے حوالے کردی اور ہدایت کی کہ جو حصہ آئے، سال بہ سال میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا۔ گاؤں چونکہ زرعی حیثیت سے بہت آگے تھا، دو نہریں گاؤں کو کاٹتی ہوئی گزرتیں اور ان سے نکلنے والے بیسیوں ندی نالے زمین کو سیراب کرتے، اسی لیے گاؤں سرسبز و شاداب اور سایہ دار درختوں سے بھر گیا۔ جدھر کو نظر کیجیے، برگد، پیپل، جامن اور آم کے درختوں کا ایک سلسلہ تھا۔ زمین کا ارشد کے ہاتھ لگنا تھا کہ یہاں چکر ہی اور ہو گئے۔ چھ بھائیوں نے وہ محنت کی، وہ پسینہ بہایا کہ پہلے سال ہی فصل دُگنا ہوئی۔ پھر کیا تھا، باداموں کے توڑے اور سچے موتیوں سے پیالے بھر گئے۔

مکان کا اور اپنا نقشہ تو کیا بدلنا تھا، البتہ کبوتروں، بٹیروں اور مرغوں کے مزید دن پھر گئے۔ اس سے اگلی فصل پر نئی کابکیں اور چھتریاں بن گئیں۔ ایک بڑا ٹیپ ریکارڈر خریدا گیا۔ اب سارا سارا دن اس پر عالم لوہار، مہدی حسن اور نور جہاں سُنے جاتے۔ مزید دو سال گزرے تو ایک وی سی آر لے لیا گیا، جس پر سلطان راہی کی فلمیں چلتیں۔ ہر شام ایک جشن کا سماں ہوتا۔ کوئی دو سو آدمی اکٹھا ہوجاتے۔ حاجی کی فلم لگتی (سلطان راہی کو حاجی کہتے تھے) اور اس کے ہر ایکشن پر اچھا اٹھ اٹھ کے گرتا۔ دوسرے دن فلم کی اسٹوری ہر اس شخص کو سناتا جس نے رات فلم نہ دیکھی ہوتی، اور یوں ایکشن بنا بنا کے سناتا کہ مزہ آجاتا۔ میں نے بہت دفعہ جی میں چاہا کہ کاش میں فلم نہ دیکھتا، اچھے سے اسٹوری سن لیتا۔ کبوتر بازی کے مقابلے بھی مزید زور و شور سے ہونے لگے۔

زمین کاشت کرتے چار سال گزر گئے۔ چودھری سال بعد آتا تو یہ اس کا حصہ اس کی جھولی میں لا رکھتا۔ چودھری بجائے خود ایک نیک انسان تھا۔ وہ بھی سب وہیں غریبوں میں بانٹ دیتا۔

لندن میں اس کے بیوی بچے عرصے سے رو رہے تھے۔ وہاں اپنا گھر تھا اور سوائے ایک تنگی کے اُدھر کوئی مشکل نہ تھی، کہ گھر کے کام کرنے والا ڈھنگ کا کوئی ملازم نہ ملتا تھا۔ اول تو مہنگے ہوتے، دوسری ان میں خرابی یہ ہوتی کہ کام بھی ادھورا کرتے۔

پچھلے سال چودھری گاؤں آیا تو عجیب خبر لایا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ ارشد کے لیے لندن سے ویزا لایا ہے۔ خبر کیا تھی، جنت کا پروانہ تھا۔ تمام گھر ناچنے لگا۔ خوشی میں آ کر کئی کبوتر اڑا دیے (شام کو دوبارہ پکڑ لیے جب جوش ٹھنڈا پڑا) اور ایک بھینس بیچ کر سارے گاؤں کی دعوت کی۔ نیا لباس خریدا گیا، جسے ارشد ''شنٹ پینٹ'' کہتا۔ گاؤں میں کون گھر ہوگا جہاں نہ گیا ہو۔ بڑا بھلا معاف کروایا اور ایک ایک کبوتر اور بٹیر کو ہاتھ پھیرا، سو سو بار چوما، ایسے کہ خود ہمارے بھی آنسو نکل آئے۔ بارہ فروری کو لندن کے لیے رخصت ہوا تو پورے گھر پر یوں نظر ماری جیسے مرنے والا ہو۔ آدھا گاؤں رخصت کرنے آیا اور دہاڑیں مار مار کے روئے۔ خود میں اسے شہر تک چھوڑنے گیا۔

''میاں، سب سے پہلے میں تو اپنے شاہ مدار (مرغے کا نام) کے لیے پانچ تولے سونے کی پازیبیں بناؤں گا، باقی کام بعد میں،'' بابے چراغ نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

عارف جو بھینس کا دودھ دوہ رہا تھا، بولا، ''لو اور سنو، یہ صرف پانچ تولے کو روتا ہے! میاں جی، یہاں تو اب مرغے کے مرغے سونے کے آئیں گے۔''

''اونھ! مرغے سونے کے آئیں گے!'' جیدا پھنکارا۔ ''ریت ڈھوتے ڈھوتے سینے میں ریت کی فیکٹری لگ گئی اور یہ مرغے خریدیں گے۔ میں تو اب پندرہ دن سے زیادہ کام نہیں کروں گا۔ پہلے اپنی تین چار ٹریکٹر ٹرالیاں خریدیں گے، اس کے بعد باقی سب کچھ دیکھا جائے گا۔''

جیمل جو ایک طرف کلہاڑے سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا، کہنے لگا، ''ٹریکٹر چلائے گا تیرا باپ؟ تجھے تو گدھی ہانکنا نہیں آتی۔ سب سے پہلے جونسرے کی گائی خریدی جائے گی۔''

''بکواس بند کراوئے اونٹ کے تھوبڑے والے! گدھی ہانکے تیرا باپ، یہاں تو ایں جناب چاند گاڑی تک چلا لیتے ہیں،'' جیدا دوبارہ بولا۔

''صاحب، میرا تو ایک ہی فیصلہ ہے،'' عارف کہنے لگا۔ ''پہلے تو خریدیں گے کوئی دو ہزار ایکڑ زمین۔ پھر اس میں تربوز بوئیں گے اور جی بھر کے کھائیں گے۔ اس کے بعد لاہور کا چڑیا گھر خریدیں گے، جہاں پر اپنی مرضی کے جانور رکھیں گے۔''

''پتر، مجھے تو بس ایک ہیرے کا کوکا اور سونے کا کنٹھا بنوا دینا۔ اس آخری عمر میں ہی سہی، کچھ تو شوق پورا کرلوں،'' مائی چراغن آٹا گوندھتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

''مائی، تو فکر نہ کر،'' صادق نے باپ کے ہاتھ سے حقے کی نے پکڑتے ہوئے کہا، ''تیرا تابوت بھی سونے کا بنائیں گے، بلکہ مصر سے خرید لیں گے۔ سنا ہے ان کے ہاں بڑے عمدہ تابوت پڑے ہوئے ہیں۔''

''تابوت خرید اپنی ساس کے لیے، اپنے سُسر کے لیے! تابوت خرید اپنی اس چڑیل بیوی کے لیے!'' اور چمٹا پکڑ کر مارنے کو دوڑی۔ ادھر وہ ہنستے ہوئے باہر بھاگ گیا۔

الغرض بڑے بڑے منصوبے طے ہوئے جس کے لیے برطانوی حکومت کا پورا بجٹ بھی کم پڑ جاتا۔ ہر تیسرے دن خط لکھا جاتا۔ اس میں روزانہ کی ڈائری، کبوتروں کا احوال، بٹیروں اور مرغوں کی تفصیل بتائی

جاتی۔اُدھر سے بھی بغیر تعطل کے برابر جواب آتا جس میں بار بار اپنے کبوتروں کا ایک ایک کر کے حال پوچھا جاتا۔اور جب مئی کے پہلے ہفتے پچاس ہزار روپیہ آیا تو پورا گھر باؤلا سا ہو گیا۔پیسے خرچ کرنے کی جگہ نہ سوجھتی تھی۔اسکیمیں بننے لگیں اور طرح طرح کے موضوع زیرِ بحث آئے۔گاؤں کے ایک دو چودھریوں سے بھی مشورہ کیا۔آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ابھی تو ابتدا ہے۔صرف یہ پچاس ہزار ہی تو نہیں،اس کے بعد بھی تو اب پیسے آتے رہیں گے،لہٰذا ان پیسوں سے تمام کبوتر بازوں کی دعوت کی جائے اور اب کے جون میں جو کبوتر بازی کا مقابلہ ہو،اس میں ایک شاندار جشن بھی منایا جائے،جس میں کسی اچھے گلوکار کو سنا جائے۔بس پھر کیا،پندرہ جون تو سر پر آ گیا تھا،جشن کے اشتہار چھپ گئے۔اردگرد کے تمام گاؤں میں اطلاعیں کروا دیں،اور تمام تفصیل اچھے کو پہنچا دی گئی کہ اس دفعہ ایسا شاندار مقابلہ ہو گا جو ان کانوں نے سنا نہ آنکھوں نے دیکھا۔پھر دوسری طرف سے بھی خط پہ خط آنے لگے۔یوں کرو اور ووں کرو۔جیسے جیسے دن قریب آتے گئے،اضطرار بڑھتا گیا۔بابے چراغ دین کے گھر میں رونق دُگنی ہو گئی۔ایک اٹھتا تو چار آ بیٹھتے اور وہ وہ قصے کہتے کہ پیشہ ور داستان گوؤں کے کان کاٹتے۔

صبح چھ بجے ہی کبوتر باز سکول کی گراؤنڈ میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔(سکول میں ان دنوں تعطیلات ہوتی تھیں۔)حمید امراثی ڈھول لے کر آ گیا اور اس نے زور سے ڈھول پر تھاپ لگانی شروع کر دی۔سایہ دار درختوں کے نیچے ماشکی نے چھڑکاؤ کر دیا اور چارپائیاں بچھ گئیں۔دیگوں کا سامان بہم پہنچایا جانے لگا۔ساڑھے سات بجے تک تمام خلقت جمع ہو گئی۔بابا چراغ دین سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔شاہ مدار مرغ گود میں تھا۔آج گاؤں کے چودھری بھی صبح ہی سے آ بیٹھے۔ہر طرف اتنی گہما گہمی اور زور شور تھا جیسے شاہ کبیر کا میلا ہو۔

بابے چراغ دین نے سوچا،اے کاش کوئی کیمرا لگا ہوتا تو یہ سارا سماں اچھا لندن میں بیٹھا دیکھتا اور کتنا خوش ہوتا۔بہر حال،اگلے سال جب چھٹی پر آئے گا تو پھر ایسا ہی ایک جشن اور کرا دیں گے،بلکہ اب تو ہر سال ایسا ہی جشن کرائیں گے۔

پورے آٹھ بجے ریگلے سے ایک پٹاخہ چھوڑا اور اس کے ساتھ ہی ڈھول پر تھاپ پڑنے لگی۔پھر نعروں کی گونج اٹھی۔ایسا شور بلند ہوا کہ کان پھٹنے لگے۔اس کے ساتھ ہی تمام کبوتر فضا میں بلند ہو گئے۔اس پر ڈھول کی تھاپ اور نعرے مزید زور پکڑ گئے،پٹاخے اور ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔یوں کہ ہر طرف شور ہی شور۔کان جیسے کچھ سنتے ہی نہ ہوں۔

پھر اچانک اس شور میں رکشے کی پھٹ پھٹ نے مزید اضافہ کر دیا،جس میں سے نکلتے ہوئے اچھے نے ''یا علی مدد!'' کا نعرہ لگایا اور بھاگ کر اپنے جونسرے کو اڑتے ہوئے دیکھنے لگا۔اچھے کا نعرہ سُن کر بابے چراغ دین کا دل بیٹھ سا گیا۔اس نے حسرت سے اپنے شاہ مدار کے پاؤں کی طرف دیکھا جو پازیبوں سے خالی تھے۔

بیچارگی

نورے نے عرض کیا،''راؤ صاحب، وہ مال تو فیضاں کا ہوا، کیونکر واپس کرے گی۔ بیچاری ساری رات گھنگرو باندھ کر ناچی۔ اور پھر کون سا اس نے چھینا ہے۔ راؤ شوکت خاں نے خوشی سے دیا۔''

''بھڑوے! تو مجھے سمجھاوے ہے،'' راؤ عبدالجمیل خاں گرج کے بولا۔'' سہر میں گند پھیلا رکھا ہے، سر پھرے لوگوں کا تم نے راستہ بند کیا ہے۔ ایک تو مرا بیٹا خراب کر دیا، اوپر سے کہوے ہے خوسی سے دیا۔''

''راؤ صاحب،'' نورا دوبارہ لڑکھڑاتی زبان سے بولا،'' شوکت خاں کو ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ وہ تو کئی دن سے ہم خود تکلیف میں ہیں مگر رو کیں تو شہر میں رہیں کیسے؟''

''اچھا... آ... آ! تو یوں کہو کہ مرے بیٹے کی وجہ سے تمھیں تکلیف ہووے!'' جمیل خاں ایک دم بھڑک اٹھا۔''فیضاں کو تکلیف ہووے۔ تری ماں جو رنڈی ہے، جس نے کوئی مرد سہر میں نہیں چھوڑا، اسے تکلیف ہووے۔ ابے حرام کے، تو ہمیں سمجھاوے؟ ہمیں تکلیف بتاوے؟ ٹھہر، تجھے میں بتاؤں ہوں۔'' یہ کہہ کر ہاتھ میں پکڑی بیت ایک دم نورے کے منہ پہ ماری جس کی وجہ سے اس کے ہونٹوں سے خون کا فوارہ چل نکلا۔

اس کے ساتھ ہی حبیب خاں نے راؤ جمیل کو آگے بڑھ کر پکڑ لیا۔ لیکن جمیل خاں غصے سے کانپ رہا تھا۔'' الٹا کہوے، سہر میں رہویں کیسے۔ گویا ہم ظالم ہیں۔ او پورے سہر کی اکیلی اولاد! آج سام سے پہلے میرا دس ہجار میری میج پہ ہووے جو رات سوکت فیضاں کو دے آیا ہے۔ ورنہ صبح ساری رقم تیری ماں کی... سے نکال لوں گا اور تینوں کا قیمہ الگ بناؤں گا۔ سن لیا ڈنے؟ اب جا دپھا ہو جا یہاں سے۔''

اور اپنی بیت منیر موچی کو دیتے ہوئے بولا،'' اسے اچھی طرح کلمہ پڑھ کے دھولا۔ کس پلید کو جا لگی۔''

اب نورے کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ راؤ جمیل کا ایک ایک لفظ پہاڑ کی طرح اس کے سر پر گرا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ڈیرے پر بیٹھا ہر شخص چڑیل ہو اور اگر وہ جلدی یہاں سے نہ گیا تو وہ اپنے ناخن اس کے سینے میں داخل کر کے کلیجہ نوچ لیں گے۔

لیکن جیسے ہی جانے کے لیے مڑا، اس کا پاؤں دہلیز سے ٹکرا گیا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔

''دیکھ کے چل، اندھے! غیرت کے ساتھ کیا آنکھیں بھی گئیں؟'' ڈیرے پر بیٹھا ایک اور بولا۔

نورے نے جلدی سے اپنا صافہ ہونٹ اور ناک پر رکھا جو بری طرح زخمی ہو گئے تھے، اور باہر نکل گیا۔

گھر پہنچتے تک پورا صافہ خون سے بھر گیا۔ وہ دیکھ کر حیران کہ اتنا خون بہہ گیا مگر اسے پتہ ہی نہ چلا۔ اس نے سوچا، شاید جو دلے ہوتے ہیں انھیں درد نہیں ہوتا۔ میں تو اوپر سے رنڈی کا بیٹا ہوں، پورے شہر کی اکیلی اولاد۔

بڑبڑاتے ہوئے چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ شریفن نے دیکھ لیا۔

''ہائے نورے، تجھے کیا ہوا؟ اللہ نہ کرے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا؟ لاکھ بار کہا یہ رکشہ چلانے کا دھندا چھوڑ۔ اللہ فیضاں کو سلامت رکھے، ہم کون بھوکے مرتے ہیں کہ سارا دن دھواں کھائیں۔ ماں صدقے، سارے چہرے کا ستیاناس کر لیا۔''

''اماں، یہ اسی فیضاں کی وجہ سے ہوا!'' نورا غصے سے چیخا۔

''ہائیں!'' شریفن ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔'' اے ہے، اس بیچاری نے کیا کیا؟ ایک تو کما کر کھلاتی ہے، اوپر سے وہی قصوروار۔ خبردار جو اس کو کہو۔ اس کی ماں نے مرتے وقت مجھ کو سونپا اور میں نے بیٹی کی طرح پالا پوسا، تو نکھٹو اور آوارہ نکلا۔ نہ طبلے کی جانچ، نہ بیٹی کا فن۔ بس موئے رکشے کی پھٹ پھٹ اور دو دو ٹکے کی سواری۔ میں کہتی ہوں جو اپنا پیشہ چھوڑتا ہے ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے۔'' شریفن کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ساری ہیرا منڈی نورے اور شریفن کے گرد سمٹ آئی۔ اسی شور میں فیضاں کی آنکھ بھی کھل گئی جسے رات ایک لمحے کو سکون نہ ملا تھا۔ آنکھیں ملتی ہوئی صحن میں آ گئی اور دیکھ کر حیران ہوئی کہ ماجرا کیا ہے۔

جب ہر طرف سے سوالات کی بارش ہوئی تو نورا پھٹ پڑا۔

''ہاں میں دلا، میں بھڑوا، سارے شہر کی اکیلی اولاد... اور یہ رنڈی، جس نے کوئی مرد شہر میں نہیں چھوڑا...'' غصے میں نورے کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ ادھر شریفن سمیت تمام محلے والوں نے کانوں میں انگلیاں لے لیں۔

پھر اچانک نورے کو یاد آیا کہ آج پہلی دفعہ اس نے ماں کو رنڈی کہا۔ کچھ دیر چپ کر کے پھر بولا،'' ادھر وہ آتا ہے اور ساری رات اس کو نچاتا ہے۔ یہ کنجری، یہ سب کنجریاں، سارا محلہ ڈنوں کا منہ دیکھتا ہے۔'' یہ کہہ کر نورا اندر چلا گیا۔ پھر آہستہ سے اس کے پیچھے فیضاں بھی۔

نورے کو گھر سے گئے تیسرا دن تھا۔ شریفن اور فیضاں نے کس کس سے نہیں پوچھا۔ ہر معلوم ٹھکانے سے پتہ کرایا۔ کہیں سے خبر نہ ملی۔ دونوں سخت پریشان کہ اب کیا کریں۔ ادھر فیضاں ہر گاہک کو باہر ہی سے ٹرخا رہی تھی۔ پریشانی میں اسے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

آج پھر عشا کی اذان ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس عالم میں فیضاں کوٹھے کی چھت پر ٹہلتی جاتی اور نورے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک کار کے رکنے کی آواز آئی۔ اس نے اوپر سے جھک کر دیکھا تو مزید پریشان ہو گئی۔ راؤ شوکت لڑکھڑاتا ہوا اس کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، اتنے میں شوکت خاں بغیر دستک دیے اندر گھس آیا۔

فیضاں چھت سے اتری تو دیکھا، شریفن اس سے نال مٹول کر رہی ہے۔ مگر فیضاں نے دیکھا کہ اس کی باتوں کا شوکت پر کوئی اثر نہیں ہو رہا، بلکہ نشے کی حالت میں وہ فیضاں کو تکتا چلا جا رہا ہے۔

اس رات فیضاں پھر ایک پل نہ سو سکی۔ بیچاری انکار کرتے بھی ڈرتی تھی کہ اُس کے باپ کا شہر میں طوطی بولتا تھا۔ ذرا چوں چرا کرتی تو ٹھکانا نہ ملتا۔ رات کے پچھلے پہر جب فیضاں نے شوکت کو راؤ جمیل خاں کی طرف سے کی گئی توہین یاد دلائی تو وہ الٹا بپھر گیا۔

''سسری، تو چاہتی ہے میں ابا کو رگیدوں۔ سکر کرو نورا زندہ ہے۔ ورنہ جیسے ابا کے آگے وہ بولا تھا، میں ہوتا تو ٹکڑے کر کے کتوں کے دھورے پھینک دیتا۔'' یہ کہہ کر ہزار روپیہ فیضاں کے آگے پھینکا اور باہر نکل گیا۔ فیضاں ڈر کے مارے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ روپیہ لیتے جاؤ، ورنہ کل اسے دو ہزار واپس کرنا پڑیں گے۔

ابھی فیضاں کی آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو نورا سامنے کھڑا تھا۔ فیضاں تو پیچھے ہی کھڑی رہی مگر شریفن نورے سے لپٹ گئی اور منہ سر چومنے لگی۔ لیکن وہ پتھر کی طرح کھڑا رہا۔ اس سے پہلے کہ اس سے کچھ پوچھتیں، نورا آگے بڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج نورے کو گھر آئے چھٹا دن تھا لیکن اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی تھی۔ بالے اور طیفے کے ساتھ فلاش کھیلنا تو ایک طرف، ہیرا منڈی کے چوک میں بھی ایک لمحے کو نہیں بیٹھا۔ سب حیران تھے، آخر نورے کو ہو کیا گیا ہے؟ ایسے واقعات تو ہیرا منڈی میں آئے دن ہوتے تھے۔ ایک دفعہ فیضاں نے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر نورے کے تیور ایسے لگتے تھے کہ ابھی کاٹ کھائے گا۔

کہنے لگا، ''میرا تجھ سے کیا رشتہ، سوائے اس کے کہ میں تیرا دلال ہوں۔ لیکن تیرے باپ کا تو پھر بھی پتہ ہے۔'' بیچاری چپ سادھ گئی۔ ادھر شریفن کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ اس سے پہلے اس نے بیٹے کی بدلی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھی تھی۔ بلکہ اب تو اس کے کمرے میں بھی آتی ہوئی ڈرتی۔ اور دل ہی دل میں دعا کرتی کہ جب تک نورے کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا، خدا کرے کوئی گاہک نہ آئے اور دروازے کو ایسے کنڈی چڑھائے رکھتی جیسے شریفوں کا گھر ہو۔

ساتویں دن صبح ہی، جب شریفن چولہے پر بیٹھی چائے بنا رہی تھی، نورا پاس آ بیٹھا اور آہستہ سے بولا، ''اماں، ایک بات بتا۔''

شریفن ایک دم خوش ہو کر بولی، ''ماں صدقے، پوچھ بیٹا کیا بات ہے۔''

نورا اور نزدیک ہو کر بولا، ''سچ بتا جس کا نام میرے شناختی کارڈ پر ہے، کیا وہ میرا اصلی باپ ہے؟ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بتا۔''

شریفن نورے کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ لیکن پھر سنبھل کر نورے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بیٹا، میں لاکھ رنڈی سہی، مگر تیرے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔ اور ہے بھی تو نکاح کا۔ قاسو لاکھ انکار کرے لیکن ہے وہ تیرا ہی باپ۔'' پھر ایک دم حوصلہ پا کر بات بدلتے ہوئے بولی، ''پر نورے، یہ تو بتا تو اتنے دن غائب کدھر رہا؟''

نورے کے لہجے میں خود اعتمادی لوٹ آئی۔ ''کہیں مکان کا سودا کرنے گیا تھا۔ مگر اب یہیں رہیں گے۔''

الیکشن کے رزلٹ ایک کے بعد ایک آنے لگا۔ چھوٹے پولنگ سٹیشن پر تو کب کی گنتی ہو چکی تھی لہٰذا اب مغرب کی اذان سننے کا کسے ہوش تھا۔ احاطے کا صحن سینکڑوں آدمیوں سے بھر گیا اور خوشامدیں ہونے لگیں۔

''راؤ صاحب نے پیسہ تو پانی کی طرح بہا دیا،'' ایک بولا۔ ''کسی نے ایک مانگا تو دس دیے۔ خدا قسم ان کمپین کے بیس دنوں میں تو کمی کمین نے اپنے گھر کا چولہا نہ جلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔''

ایک اور شخص نے لقمہ دیا جو راؤ جمیل خاں کے پہلو میں بیٹھا تھا، ''بھئی اب بھی ووٹ نہ ملتے تو سالی رعایا کا قیمہ نہ بنا دیتے؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ پیسے کے علاوہ انسان کی کوئی خاندانی شناخت بھی ہونی چاہیے تاکہ سر اٹھا کر بات بھی کر سکے۔ پتہ نہیں پیاز کھانے والے کہاں سے آ گئے راؤ صاحب کے مقابلے میں الیکشن لڑنے۔''

اب راؤ جمیل خاں نے فخر سے سگار کا گہرا کش لیا۔

دوسری طرف شمیم بھٹی بول اٹھا، ''راؤ صاحب، ویسے آپ نے الیکشن میں بڑی گیم ماری ہے۔ چودھری اعجاز کو دس لاکھ دے کر اپنے چچا ہی کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ چودھریوں کے ووٹ بٹ گئے اور آپ صاف نکل گئے۔ اب آپ تو الیکشن جیتے، وہ الٹا ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اِسے کہتے ہیں سیاست۔''

راؤ جمیل خاں نے اپنی تعریف سن کے پہلو بدلا اور ایک اور گہرا کش لیا۔

''میاں، سیاست میں خون جلانا پڑتا ہے تب کہیں جا کے گھر میں روشنی ہووے۔ اور بھائی، حکومت بچے بھی راجپوتاں کو ہی۔ باقی ذاتاں تو بس کمی کمین ہوویں۔ ان میں عقل تو ہوتی نہیں، حکومت کیا خاک کریں!''

راؤ جمیل خاں کے اس تبصرے پر ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔

رات نو بجے تک قریب قریب رزلٹ سارا آ گیا جس کے مطابق راؤ جمیل خاں ہزاروں سے جیت رہا تھا۔ اب جو چند پولنگ اسٹیشن رہ گئے تھے ایک تو ان کے ووٹوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی، دوسرے وہاں بھی راؤ جمیل کی فتح کے واضح اشارے تھے، لہٰذا چودھری شفیع محمد کی شکست یقینی تھی۔

ہر طرف سے مبارکیں وصول ہونے لگیں۔ راؤ صاحب نے آج جو میدان مارا تھا وہ واقعی پانچ سال کی فتح تھی۔ بلکہ راؤ صاحب نے سوچا کہ اب تو یہ پشت در پشت چلے گی۔

رات کے دس بجے عوام کے ساتھ سرکاری افسران بھی تحفے لے کر آنے لگے۔ تھوڑی دیر میں نوٹوں کے ہار اور مٹھائی کے ڈبوں کا پہاڑ جتنا ڈھیر لگ گیا۔ رات ایک بجے راؤ صاحب کی فتح کا مکمل اعلان ہو گیا۔ ٹھاہ ٹھاہ کی آوازیں آنے لگیں۔ راؤ صاحب کی کوٹھی کے سامنے بہت بڑا مجمع تھا۔ کلاشنکوف اور پستول کے ہوائی فائر ہونے لگے۔ راؤ جمیل نے شوکت خاں کو آواز دی، ''سوکت خاں، بھاگیو کچہری روڈ سے فیاض قریشی کی دوکان کھلوا کے دس بیس ہجار کے روندو فوراً لے آئیو۔ کوئی اور گیا تو وہ سسرا رات کے اس سے دکان نہیں کھولے گا۔''

رات جوں جوں گزرتی گئی تحفوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ راؤ صاحب نے آنے والے مہمانوں کے لیے جلدی سے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ لہٰذا آناً فاناً پڑوسیوں کی سات آٹھ بھینسیں پکڑ کر حلال کر دی گئیں۔ دیگیں چڑھ گئیں۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں نپٹایا جانے لگا۔ الاؤ روشن ہو گئے۔

جو لوگ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے وہ اب آگ کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ دہکتے کوئلوں کی ایک بڑی انگیٹھی راؤ عبدالجمیل خاں اور پاس بیٹھے ہوئے شرفا کے درمیان رکھ دی گئی۔ حقے کی نے دائرے میں چلنے لگی۔

رات کے پچھلے پہر سردی کافی بڑھ گئی تھی، لیکن انگیٹھی سے اٹھتی حرارت اور تازہ فتح کی وجہ سے راؤ عبدالجمیل خاں سرور کے عالم میں بیٹھا تھا۔ چاروں طرف سے گپیں ہانکی جا رہی تھیں اور چائے کے دور چل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دھند اور کہر بھی کافی بڑھ گیا کہ نظر دس فٹ سے آگے نہیں جاتی تھی۔ اتنے میں ایک شخص کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ راؤ جمیل خاں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو نورا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ غالباً اس کے سر پر رکھی ہوئی بوری کافی وزنی تھی۔ پاس آ کر نورے نے بوری اپنے سر سے اتار کر راؤ جمیل خاں کے قدموں میں رکھ دی اور اسے الیکشن میں کامیابی کی مبارکباد دینے لگا۔

''راؤ صاحب، میں نے سوچا میں بھی آپ کو مبارک دے آؤں اور یہ تحفہ (بوری کی طرف اشارہ کر کے) آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ نوٹوں کے ہار اور مٹھائی تو آنی جانی شے ہے لیکن جیسی شاندار آپ نے آج کامیابی حاصل کی ہے ویسا ہی تحفہ بھی ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے بوری کا منھ کھول دیا جسے دیکھ کر راؤ جمیل اور دوسرے تمام لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بوری میں راؤ شوکت خاں کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے جن میں سب سے بڑا ٹکڑا سر کا تھا۔

''راؤ صاحب!'' نورا پھر بولا، ''میں نے سوچا آپ شریف آدمی ہیں۔ یہ شوکت خاں آپ کو ذلیل کرے گا۔ آج پھر یہ فیضاں کے پاس چلا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں ایک اور نورا یا فیضاں پیدا ہو جائی۔ ادھر آپ راجپوت ہیں۔''

راؤ جمیل خاں کو ایسے لگا جیسے یہ آواز کسی گہرے کنویں سے سن رہا ہو۔

قائم دین

''ہاں تو بول اس ڈبے کھری کا کیا لے گا؟ ویسے ایک بات کہوں؟ چوری کا مال ہے سوچ کے مول لگانا۔ کل کلاں پُلس آ گئی تو اس کے ساتھ بھی مک مکا کرنا پڑے گا،'' نور دین نے بھینس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''دیکھ میاں نورے، پانچ ہزار سے ایک ٹکا نیچے نہیں لوں گا۔ اٹھارہ لیٹر دودھ سویرے شام باٹوں سے تول لینا۔ قطرہ کم ہوا تو تھڑے پر مونچھ منڈواؤں گا۔ رہی پُلس کی بات! اگر تجھے کوئی پوچھے، سیدھا میرے چھپر کی راہ دکھانا، میں جانوں اور پُلس،'' قمے نے صاف روکھے پن سے مول بتاتے ہوئے کہا۔

''پانچ ہزار، قہر خدا کا! آخر بھینس ہی تو ہے، کوئی ہاتھی تھوڑی ہے۔ پھر تم کون سا مول لے کے آئے ہو۔ مفت کی مار ہے۔ تین ہزار لو اور کمبل سے جان چھڑاؤ،'' نور اپھر بولا۔ ''مائی نذیراں کو تو پچھلے مہینے بیل برابر گائے ایک ہزار ہی میں دے دی اور مجھ سے پانچ ہزار مانگتے ہو!''

''اے چل، مفت کی مار ہے! بارڈر پار سے مال چوری کر کے لانا تو ایک طرف، ذرا آدھی رات کو دریا پار کر کے ہی دکھا دے۔ ایسی تین بھینسیں مفت میں نہ دوں تو نظام دین کا نطفہ نہیں،'' قمے تلخی سے بولا۔ ''پوہ کی ٹھنڈی راتوں کو چڑھتا ستلج پار کر کے ڈیلے کے جنگلوں میں کالے سانپوں کی سریاں پاؤں سے کچلنا اماں جی کا کھیل نہیں۔ اور پھر بارڈر پار یہ مال سکھڑے کوئی ہتھیلی پر رکھ کر نہیں کھڑے ہوتے۔ موت کے منہ سے نکال کے لاتا ہوں۔ اور تجھے مفت میں دے دوں؟ اگر پانچ میں لینی ہے تو لے، ورنہ اپنا رستہ ناپ۔ مائی نذیراں کا تجھے ٹھیکہ ہے کیا؟ بیچاری کا آگا نہ پیچھا، اکیلا دم۔ میں اُسے مفت میں دوں یا پیسے لوں، تجھے کیا درد؟''

قمے کی بات سن کر نور دین کھسیانا سا منہ لے کر باڑے سے باہر نکل آیا۔ اِدھر قمے نے جلدی سے بھینسوں کو ٹرک پر لادنے کی تیاری کی جو اس کا بھائی جلال دین رات ہی منڈی احمد آباد سے کرائے پر لایا تھا۔ وہ اس میں چھ بھینسیں اور دو گائیں لاد کر لائلپور کی منڈی میں لے گیا۔

اُدھر جلال دین مال لے کر چلا، اِدھر قصہ خوانیاں شروع ہو گئیں۔

''بھائی شادھے خاں،'' قمے نے مونچھ پہ ہاتھ پھیر کر حقے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ ''جب میں دریا کے کنارے پہنچا تو رات کے نو بجے تھے۔ رات گھپ اندھیری، ایسی کہ عزرائیل بیچارے کے بھی ساہ نکل جائیں۔ اُدھر ستلج کا ٹھاٹھیں مارتا ٹھنڈا پانی۔ میں نے دل میں کہا، لے بھئی قمیا، تیرا رب راکھا اور سائیں چانن شاہ تیرا مددگار۔ مار دے چھلانگ دریا میں۔ بس پھر ایک دو منٹ ٹھنڈ لگی، اس کے بعد تو میں دریا کو چیرتا ہوا گزرا۔ پندرہ منٹ میں رب سائیں کے کرم سے اگلے کنارے پر تھا۔''

''اور ڈیلے کا جنگل کیسے پار کیا؟ وہاں تو گلہریوں کی طرح سانپ ناچتے ہیں،'' شمس علی نے حیرانی سے پوچھا۔

''شمے خاں! ڈیلے کا نہیں، سانپوں کا جنگل کہو، سانپوں کا!'' قمے میٹھی دھوپ میں انگڑائی لیتے ہوئے بولا، ''اتنے موٹے ہیں کہ بندے کو ثبوتا کھا جائیں۔ ڈکار لینا تو الگ بات، زبان تک نہیں چاٹتے۔ بس دو کروٹیں لیں، بندہ ہضم۔ قسم چانن شاہ کی، ان آنکھوں نے بیسیوں بندے ڈیلے کے اس جنگل میں غائب ہوتے دیکھے۔ دو چار تو میرے سامنے نگلے گئے۔ اب میں کوئی بچہ تھا جو اس کا توڑ نہ جانتا۔ پیر نظام بخش سے منتر اسی اوکھٹ کے لیے تو سیکھا۔ بس بھائی اِدھر میں نے منتر پڑھا، اُدھر باشک ناگ، کل ساڑ، ارگن ناگ، پدم ناگ، کھپرا، کلچوڑیا، سنگچوڑ، کلہریا، ایک ایک کر کے سلامی کو حاضر ہوئے۔ نیل بانیا منکر ہوا تو ایک پھونک مار کے دھواں کر دیا۔''

''لیکن سوَر پر تو منتر چلتے نہیں اور میں جانتا ہوں دس بیس نہیں، سینکڑوں سوَر اس جنگل میں ہیں، گویا ہندوستانی فوج کٹاریں منہ میں دبائے پھرتی ہو۔ اُن سے کیسے نبھی؟'' حامدی نے لقمہ دیا۔

''واہ حامدی واہ، یہ تو نے خوب کہی! یہ دیوار سے لگی چھپلی برچھی کو دیکھو، کاٹتے وقت دشمن اور سوَر میں فرق نہیں کرتی۔ پندرہ سوَر کاٹ کے دیکھ کتنے آرام سے لیٹی ہے۔ جنم جنم کی ساتھی۔ بھاگ بھری نے رات کمال کر دیا۔

''قصہ مختصر،'' قمے نے داستان آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''سوَروں کو پھاڑتا اور سانپوں کو کچلتا ہوا رات ایک بجے پھجا سیئوں کی بھینی[1] پر پہنچا اور ایک ایک کر کے ساری بھینسیں کھول کر آگے کر لیں۔ مونجی کے کھیت سے ہوتے ہوئے ایک گھنٹے میں بارڈر سے اِدھر لے آیا۔''

''تو کیا سکھڑ افیم کھا کے سویا تھا جو جاگا نہیں؟'' ارشاد علی نے پوچھا۔

''سالا آدمی کہاں؟ بھینس ہے۔ روزانہ چار جگ لسی پی کے سوتا ہے۔ جو اتنی لسی پی لے، پھر وہ تو کیا، اس کے نصیب بھی سو جاتے ہیں۔''

قمے سردیوں کی اس روشن دھوپ میں تھڑے پر بیٹھا گاؤں کے لوگوں کو اپنی اس واردات کے قصے سنا رہا تھا کہ دور سے مولوی سراج دین تسبیح پھیرتا ہوا قریب آیا اور قمے کو مخاطب کر کے کہنے لگا، ''قمے،

۱۔ اس علاقے کے لوگ بھینی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مال مویشیوں کے ساتھ ان کی اپنی رہائش بھی ہوتی ہے۔ یہ جگہ دیہات سے دور اکیلا ڈیرہ ہوتا ہے۔

مالِ غنیمت مبارک ہو۔ سنا ہے رات اللہ نے تیری بڑی مدد کی۔ پورے آٹھ مویشی لایا ہے۔ بس کافروں کے ساتھ جہاد کا آج کل یہی طریقہ ٹھیک ہے۔ اللہ نے چاہا تو تیری بخشش یقینی ہے۔''

تمام لوگوں نے مولوی کی اس بات کو غور سے سنا اور فقے کی طرف رشک سے دیکھا۔ سن کر فقا بھی فخر سے مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا اور مصنوعی عاجزی سے مولوی کی طرف جھکا۔ پھر مولوی صاحب نے پندرہ بیس منٹ اسلام اور کفر پر وعظ کہا۔ اس کے بعد فقے کے گھر سے تمام لوگوں کے لیے چائے بن کر آگئی جسے سب مزے سے پینے لگے۔ چائے پینے کے بعد مولوی سراج دین اُٹھ کر جانے لگا تو سب کھڑے ہوگئے۔ دو قدم چل کر مولوی صاحب پھر رُکے اور فقے کو مخاطب کر کے بولے، ''پتر فقے، مسجد کا حصہ جلدی بھیج دینا۔ کہیں خدا ناراض نہ ہو جائے۔''

''بس مولوی صاحب، جلال دین منڈی سے واپس آجائے تو سب سے پہلے مسجد کا حصہ آئے گا،'' فقے نے تڑ سے جواب دیا۔

''لے بھئی فقے، آج سے تیسرے روز بھادوں کی سولہ ہے،'' خانو سیال نے بیٹھتے ہوئے کہا، ''میں نے تجھ پر دو ہزار کی جھنڈی رکھ دی۔ حمیدا گجر اس دفعہ کشتی میں جیت کے نہ جائے۔ شام دین اور فیضے نے اُس پر شرط لگائی ہے۔''

''چاچا خانو، تو فکر نہ کر۔ حرامی کو ایسا دھوبی پٹڑا دوں گا کہ آئندہ دس پشتوں تک کوئی کشتی نہ کھیلے گا۔ گینڈے کی اولاد نے پچھلے سال مائی جمن کے پتر کی ٹانگ توڑ دی۔ اور پسلیوں پر بھی بلاوجہ زور دیتا رہا،'' فقا تڑپ کر بولا۔ ''وہ تو کہو سردار نبی بخش نے کشتی چھڑا دی، ورنہ تو یہ اس کو مارنے ہی لگا تھا۔ مگر یہ تو بتا کہ اتنے پیسے کہاں سے آگئے جو پورے دو ہزار لگا رہا ہے؟ اور پھر کتوں کی لڑائی اور کبڈی پر بھی تو شرطیں بندھنا ہیں۔''

''پتر، تو اس کی پروانہ کر،'' خانو سیال بولا۔ ''اس دفعہ گنے اور مونجی کی فصل نے سارے دلدر دور کر دیے۔ پورے ایک لاکھ کی فصل ہوئی۔ قرضہ ورضہ دے کر بیس ہزار اس کڑے وقت کے لیے بچا رکھا ہے۔ لیکن اس سال تو نے بھی تو تین چوریاں کیں۔ وہ کیا ہوئیں؟ جہاں تک مجھے پتہ ہے، کم سے کم ایک لاکھ کا مال ہوگا۔ جانو، شریفا، شمّا اور کالو نائی تو اسی کام میں لاٹوں کے مالک بن گئے اور تو وہی پھانگ کا پھانگ!''

''چاچا، کیا بتاؤں،'' فقا تاسف سے بولا، ''جس دن چوری کر کے لاتا ہوں، دوسرے دن ہی آدھا گاؤں ادھار لینے آجاتا ہے۔ اور آج تک کسی نے ایک پائی واپس نہیں کی۔ پولیس تیسرا حصہ الگ مار لیتی ہے۔ اس کے علاوہ پندرہ لوگ گھر کے اور اللہ بخشے بھائی رحمت کا کنبہ الگ۔ بس سمجھو ادھر آیا اور اُدھر نکل گیا۔ خیر چاچا، تو اس قصے کو چھوڑ۔ اس دو ہزار میں سے ایک ہزار میرا اور باقی کا تیرا۔ اللہ نے چاہا تو سولہ بھادوں کو چانن شاہ کا میلہ رنگ دوں گا۔''

میلے میں ابھی تین دن تھے۔ چک قاسم شاہ اور اردگرد کے دس پندرہ گاؤں جو دریا کی ٹھاڑ[1] میں پڑتے تھے، سب میلے کے سوا ہر چیز بھول گئے۔ پہلوانوں کو مالشیں ہو رہی ہیں۔ کتوں اور مرغوں کی خدمتیں دگنی ہوگئیں۔ چانن شاہ کے مزار کے دائیں پہلو دریا کے کنارے اکھاڑے کی جگہ ہل چلا کر خوب نرم کر دی گئی۔ مزار پر جھنڈیاں اور رنگ برنگے دوپٹے لہرانے لگے۔ دور دور سے گاؤں کی عورتیں مزار پر گھی کے چراغ جلانے آئیں اور منتوں کا دودھ بٹنے لگا۔ ملنگوں نے بوٹی کے رگڑے اور حق علی کے نعرے اور تیز کر دیے۔

توت اور نیم کے گھنے سایوں میں دھمالیں پڑیں تو ٹھاڑ میں گویا زندگی جاگ اٹھی۔ بچوں سے بوڑھوں تک ہر کوئی مزار کی طرف رواں ہوا۔ مزار کے اردگرد کے بیسیوں ایکڑ کی زمین مٹھائی، جلیبی اور پکوڑوں والوں کی دکانوں سے بھر گئی۔

پندرہ کی رات دربار پر ہر طرف سے گھی، گیس اور تیل کے چراغ جل اٹھے۔ قوالوں اور بھانڈوں کی ٹولیوں نے اپنے اکھاڑوں کے لیے الگ الگ جگہوں پر قبضے جمائے اور آدھی رات تک تیاریوں میں مصروف رہے۔ چاند کی چودھویں کا دودھ برس رہا تھا اور خوشی کا میلہ تھا کہ شفیع کمبوہ نے خبر دی: دریا کا پانی معمول کی سطح سے بلند ہو رہا ہے، اپنا اپنا بندوبست کرلو۔ یہ سن کر اچانک لوگوں میں اضطراب پھیل گیا۔

رفیق جوئیہ گھر سے ریڈیو اٹھا لایا۔ آٹھ دس دن سے وہ یہ خبر سن تو رہے تھے کہ دریا کا پانی چڑھنے والا ہے، مگر وہ اسے افواہ ہی سمجھے، کیونکہ ہر سال ایسی افواہیں اُڑتی رہتی تھیں لیکن پانی کبھی بھی خطرے کی حد تک نہ چڑھا۔ ہاں، بیس سال پہلے ایک سیلاب آیا تھا جس نے ان کا کافی نقصان کیا۔ پھر اُس کے بعد ایسی کوئی مصیبت نہ آئی۔

رات ایک بجے سب لوگ ریڈیو کے گرد بیٹھ گئے اور خبروں میں سیلاب کے بارے میں سننے کے لیے تیار ہوئے۔ مگر تمام خبروں میں سیلاب کا ذکر تک نہ تھا۔ پھر بھی بے چینی نہ گئی۔ لوگ میلے کو بھول کر دریا کی طرف دیکھنے لگے، یہاں تک کہ دور سے پانی کی آواز سنائی دینے لگی۔ تقریباً تین بجے رات تک دریا نے اپنے پہلے کنارے ڈبو دیے اور فصلیں چاٹنے لگا۔ اب تو خوف و ہراس ایسا پھیلا کہ خلقت میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ ہی دیر میں پانی جب مزار کے قریب آگیا تو دکانوں والوں نے جلدی جلدی دکانیں بڑھائیں۔ قوال اور بھانڈ اکھاڑے سمیٹنے لگے۔ لوگ اپنے اپنے گاؤں کی طرف بھاگے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے دریا گاؤں کی کچی دیواریں کھا چکا تھا۔

رات کے سے لوگ جو کچھ سمیٹ سکے اسے سمیٹا، باقی وہیں چھوڑ کر بڑے بند کی طرف جانے لگے۔ ٹرالیاں، چھکڑے اور گدھی ریڑیاں جُت گئیں۔ مگر دریا کی رفتار ان سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ تیز و تند شور اُٹھاتا دریا فیلِ مست کی طرح چڑھا آتا تھا۔ فقے نے دیکھا تو اس نے اپنی بھینسوں اور کنبے کے سوا ہر شے وہیں چھوڑ دی اور انھیں ہانکتا ہوا بڑے بند کی طرف چل دیا۔

صبح پانچ بجے فقا اور دریا برابر بند پر پہنچے۔ بند پر فقے کی طرح اور بھی سینکڑوں لوگ دور تک کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے جلدی ٹھاڑ چھوڑ دی تھی۔ فقے نے کنارے پر کھڑے ہو کر جب دریا کو دیکھا تو اُسے ایسے لگا جیسے زمین کے اندر سے پانی کا بڑا اژدہا نکل آیا ہو۔

ا۔ ٹھاڑ: دریا اور بند کے درمیان کا نشیبی علاقہ جہاں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہوتے ہیں۔

ہزاروں چھپر بہے چلے جاتے تھے۔ سینکڑوں بکریاں اور گائے بھینسیں تیرتی اور ڈوبتی ڈباتی بند کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ اچانک اس کی نظر ارشاد علی پر پڑی جو اپنے دو بچوں اور بیوی کو بمشکل سنبھالے، ہانپتا ہوا بند کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قمّے نے جیسے ہی دیکھا، چھلانگ لگا کر چیتے کی سی پھرتی سے ارشاد علی کے پاس پہنچ گیا اور دونوں بچے اُچک کر بند کی طرف بڑھا۔ ارشاد علی کی جان میں جان آئی۔ لیکن اب قمّے کو چین کہاں۔ اِدھر اُدھر سے ڈوبتوں نے پکارنا شروع کر دیا۔ اس نے دریا سے بند پر اور بند سے دریا میں کئی چکر لگا دیے۔ بمبیوں کو کھینچ کھینچ کے باہر لایا۔ مولوی سراج دین، چودھری نور دین، فیض چودھری، خان سیال اور سینکڑوں گاؤں والے بند پر بیٹھے، لاچاری کے عالم میں، مکئی، گیہوں اور باجرے کے خلوں کو پانی میں تیرتے دیکھ رہے تھے۔ اب دریا کا پانی اتنا بلند تھا کہ بند کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ بڑے بڑے درختوں کی چوٹیاں ڈوبنے سے بچ گئیں جو پرندوں سے ڈھکی پڑی تھیں۔ دریا نے کئی درخت بھی جڑ سے اکھیڑ دیے۔ ہزاروں مویشی ڈوب گئے جنھیں پانی بہائے لیے جاتا تھا۔ اکا دکا انسانوں کی لاشیں بھی تیرتی نظر آئیں، اور دریا کا پاٹ میلوں تک پھیل گیا۔ ایسی حالت میں قمّے نے دوپہر ڈھلتے تک اپنی ڈوبی ہوئی بستی سے بند پر خدا جانے کتنے چکر لگائے اور تھک کر نڈھال ہو گیا۔ اس کے باوجود ہر ایک کی نظرِ امداد کے لیے اسی پر پڑتی اور وہ ہر چکر میں بند پر پہنچ کر ایک تفاخرانہ انداز سے لوگوں پر نظر ڈالتا جیسے کہہ رہا ہو: دیکھا! میں جو تم کو اپنے کارنامے گنواتا تھا، اب تو ان پر یقین آیا کہ نہیں؟ میرے علاوہ آج کون دریا کا سامنا کرنے والا ہے؟ ایسی نظر مار کر دوبارہ کسی مہم کے لیے بپھرے ہوئے پانی میں چھلانگ لگا دیتا۔ لیکن انسان آخر انسان ہے، دوپہر تک تھک کر نڈھال ہو گیا۔ بیوی نے یہ حالت دیکھی تو رونے لگی کہ اب نہ کودنا۔ آہستہ آہستہ اس کا اپنا جوش بھی کافی ٹھنڈا پڑ گیا۔ مگر وہ یہ سوچ کر کہ لوگ اسے نامردی کا طعنہ دیں گے، دوبارہ پانی میں کود جاتا۔ یہاں تک کہ سہ پہر ہو گئی۔ پھر اچانک یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ لوگوں کی مدد کے لیے پاک فوج دریا میں اُتر آئی ہے۔ اب اس نے جلدی سے اپنے قبیلے کو لیا اور چک جنڈ کا میں فوج کے لگائے ہوئے خیموں میں سے ایک خیمے میں جا بیٹھا۔ پھر ایسا سویا کہ دوسرے دن دوپہر ہونے پر آنکھ کھلی۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور بند کی طرف بھاگا۔

دیکھا تو ہر طرف سکون تھا۔ رات تک ہر چیز یا تو ڈوب گئی تھی یا بہہ چکی تھی۔ جدھر نظر جاتی سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا۔ ہاں، مگر پانی پر اُڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرندے ضرور قلابازیاں لگا رہے تھے، جیسے ٹھاڑ کی بربادی پر خوشیاں مناتے ہوں۔ انھیں دیکھ کر زندگی میں پہلی دفعہ اس کے آنسو نکلے۔ وہ شام تک بند پر کھڑا رہا۔ آج وہ اس قدر بوجھل تھا کہ کچھ بھی ہو جاتا وہ پانی میں داخل نہ ہوتا۔ سورج ڈوبنے لگا تو قمّے کو محسوس ہوا کہ اسے شدت سے بھوک لگی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے تو پرسوں شام سے کچھ نہیں کھایا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے بعد تو گویا یہ اس کا معمول بن گیا۔ روزانہ صبح بند پر آ کر بیٹھ جاتا اور میلوں پر پھیلے ہوئے دریا کے پاٹ کو دیکھتا رہتا، پھر شام کے بعد خیمے کی طرف لوٹ جاتا۔ ساتویں روز اس نے دیکھا، پانی اپنی سطح سے نیچے اُتر رہا ہے۔ پہلے دو دن تو آہستہ آہستہ، پھر اُس کے بعد تیزی سے سمٹنے لگا، اور ہر روز تقریباً دو فٹ نیچے چلا جاتا۔ غالباً بیس دن کے اندر اندر دریا کا پانی اپنے پہلے کناروں میں سمٹ گیا۔ لیکن زمین میں نمی اور کیچڑ اس قدر تھا کہ لوگوں کا آباد ہونا ابھی ناممکن تھا۔ جگہ جگہ تالاب بن گئے تھے۔ اِدھر اُدھر مردہ جانوروں کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں جنھیں سارا سارا دن گدھ اور کوے نوچتے رہتے۔ سینکڑوں درخت زمین پر لیٹے تھے جن میں کوڑا کرکٹ پھنسا ہوا تھا۔ اسی حالت میں سیلاب کے بعد چار ماہ گزر گئے۔ اب لوگ بھی خیموں کی زندگی سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے اپنے ٹھاڑ میں جا بسیں، مگر جدھر دیکھتے، گڑھوں میں کھڑے پانی سے تعفن اُٹھ رہا تھا۔ ہر طرف طرح طرح کی جھاڑیاں اُگ آئیں جن کی اوٹوں میں ہزار ہا بلّیات نے جنم لے لیا۔ کیڑے مکوڑوں اور سانپوں کی بہتات ہو گئی۔ اس عالم میں خیمے سے نکلنے والا پہلا شخص قمّا تھا جو اپنی بستی کے لیے بے چین تھا۔ اس کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

قمّے نے جیسے ہی دریا برد گھر میں قدم رکھا، اس کے جسم میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ تمام گھر والوں کو ساتھ لیا، کیچڑ اور مٹی گارے سے دیوار بنانی شروع کی۔ اسے دیکھتے ہوئے سارا گاؤں حوصلے میں آ گیا، حتیٰ کہ دو مہینے میں بستی دوبارہ بس گئی۔ زمین آہستہ آہستہ تعفن اور غلاظت نگلنے لگی۔ لوگوں نے مردہ ہڈیاں اور انجر پنجر دفن کر دیے۔ اپنی اپنی زمینوں کی دوبارہ حد بندیاں کی گئیں اور چھ ماہ کے اندر ہی ہل پھر چلنے لگے۔ بستی کے بہت سے درخت اُکھڑ چکے تھے۔ لوگوں نے سائے کے لیے اپنے اپنے گھروں میں دوبارہ پودے لگا دیے۔ قمّے کے گھر میں بھی تین کیکر اور ایک بیری کا درخت تھا جن پر سارا دن کوے اور چڑیاں شور مچاتے۔ ان کی آواز کانوں میں ایک قسم کا رس گھولتی تھی۔ سیلاب اُن درختوں کو بھی بہا کر لے گیا، لہٰذا قمّے نے بھی بند کے اُتاڑ[1] سے ایک بیری کا پودا لا کر گھر میں لگا دیا جو دریا کی زرخیز زمین میں خوب پنپنے لگا۔ دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ تین سال بعد تو ایسے ہو گیا، جیسے سیلاب کبھی آیا ہی نہ ہو۔ قمّے نے بھی دوبارہ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

اب دریا کے پار کا آٹھ کلومیٹر میں پھیلا ہوا ڈیلے کا جنگل پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک اور گھنا ہو چکا تھا۔ جنگل میں پانی جو کبھی ٹخنوں کے برابر تھا، وہ گھٹنوں گھٹنوں ہو گیا۔ بچھو، سانپ، نیولے اور نہ جانے کون کون سے حشرات الارض رینگتے پھرتے۔ کئی اژدہے لوٹیں مارتے، گیدڑوں، سوروں کی گڑگڑاہٹیں، الوؤں اور چڑبلوں کا شور کانوں کی سماعت چھین لیتا۔ ایسی خوفناک صورت حال میں آدمی رات تو کیا دن کو بھی وہاں سے نہیں گزرتا تھا۔ مگر قمّے کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اس نے جنگل میں کئی ایک جگہیں اپنے ٹھکانے کے لیے بنا رکھی تھیں۔ بچپن ہی سے وہ جنگل کی اونچ نیچ سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کون سی جگہ زیادہ خطرناک ہے اور کون سی کم؛ اگر کسی بلا سے واسطہ پڑے تو کیسے بچاؤ کرنا ہے۔ وہ اپنے پاس آگ کا بندوبست ضرور رکھتا۔ اُسے آگ نے کئی دفعہ خطرناک صورتِ حال سے نکالا تھا۔

دن ڈھلنے سے پہلے ہی قمّا دریا پار کر کے ڈیلے کے جنگل میں آ جاتا اور بیچوں بیچ آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ جاتا۔ رات کے پچھلے پہر بارڈر کراس کر کے گائے، بھینس، بیل یا بھیڑ بکریاں جو کچھ ہاتھ لگتا ہانک کر ڈیلے کے اسی جنگل سے ہوتا ہوا دریا پر آتا اور صبح دس بجے سے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جاتا۔ قمّا ہر چوری میں کم از کم دو ماہ کا وقفہ ضرور رکھتا۔ ہندوستانی رینجر سے کئی دفعہ پاکستانی رینجر کو شکایات بھی وصول ہوئیں۔ لیکن ڈیلے کا جنگل دونوں کے لیے مشکل پیدا کیے ہوئے تھا، جبکہ قمّے کے لیے وہی جنگل نعمت تھا۔ سیلاب کے بعد دس سال گزر گئے۔ اس عرصے میں قمّے نے خدا جانے کتنے لمبے ہاتھ مارے۔ اس نے اپنے گاؤں کو مویشیوں سے بھر دیا۔ سیلاب میں غارت ہونے والے کئی لوگوں کے چولہے مفت میں جلائے۔ بہت سوں کو سستے داموں بیچتا رہا۔

پہلے پہل تو پاکستانی رینجر اسے نظرانداز کرتی رہی لیکن اب صورتِ حال زیادہ بگڑ گئی تھی کیونکہ ہندوستانی رینجر کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا پاک رینجرز نے سنجیدگی سے چوروں کو پکڑنے کے بارے میں سوچا۔ دریا سمیت ڈیلے کے جنگل کی خفیہ ناکہ بندی کر دی گئی۔ جگہ جگہ چھاپے مارے گئے، جس میں پہلے مہینے ہی شمّا اور کالو پکڑے گئے لیکن قمّا ہاتھ نہ آیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ چوری کرنے سے پہلے پورے علاقے کی جاسوسی کرتا، تاکہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ اس نے اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے بہت سے تجربات حاصل کیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کس طرح مشکل حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے باپ نے اسے بہت سے گر بتائے تھے۔ لہٰذا اس سال اس نے صرف دو کامیاب چوریاں کیں۔

۱۔ اُتاڑ: بند سے دوسری طرف کا علاقہ جسے دریا سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

دوسری چوری اس نے دسمبر کی انتہائی سرد رات میں کی، جس میں وہ پوری گیارہ بھینسیں ہندوستانی علاقے سے تین کلومیٹر اندر جا کر لے آیا تھا۔ یہ چوری ایسی نہ تھی کہ جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ دو طرفہ رینجر میں ایک بھونچال آ گیا۔ اور افسران بالا نے انتہائی سرزنش کی۔ ان حالات میں رینجر نے اپنی سرگرمیاں انتہائی سخت اور تیز کر دیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ مال جنگل سے ہو کے نکلتا۔ پھر بھی رینجر نے تہیہ کر لیا، چاہے کچھ بھی ہو اب چور ضرور پکڑا جائے۔ مخبر تیار کیے گئے اور مکمل بندوبست انتہائی خفیہ طریقے سے کیا۔

پندرہ فروری کی سہ پہر قمّا دریا پر پہنچا تو اسے ارشاد علی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ قمّے کے ہاتھ میں چھوی دیکھ کر ارشاد مسکرایا اور دور ہی سے ہاتھ ہلا کر گاؤں کی طرف مڑ گیا۔ قمّے نے سوچا، ارشاد کتنا حرامی ہے، میری دو بھینسوں کے پیسے کھا گیا، چھ ماہ ہو گئے ایک ٹکا نہیں دیا، اب نزدیک آ کر سلام لینے سے بھی گیا۔ اُس نے سوچا، اب میں سارا مال منڈی میں ہی بھیجا کروں گا۔ گاؤں والوں کو کسی جانور کی دُم بھی نہیں دوں گا۔ اتنے مشکل حالات میں موت کے منہ سے جانور نکال کر لاتا ہوں اور یہ گاؤں والے بیٹھے بٹھائے مفت میں لے جاتے ہیں۔ خبیث بعد میں پیسے بھی نہیں دیتے۔

خیر، رات دو بجے قمّا جیسے ہی ڈیلے کے جنگل سے نکلا اور ہندوستان میں داخل ہونے لگا تو پاک رینجر نے اچانک دبوچ لیا۔ قمّے کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ جنگل میں دوبارہ داخل ہو جائے۔ وہ حیران ہوا کہ انھیں کیسے پتہ چلا۔ وہ اسی تذبذب میں تھا کہ اس کی مشکیں کس دی گئیں اور رینجر ہیڈ کوارٹر میں لے جا کر مار پیٹ شروع کر دی گئی۔ قمّے نے اپنی زبان ایسی بند کی کہ رینجر کا ہر طریقہ فیل ہو گیا۔ دو مہینے تک قمّے کو اتنی مار پڑی کہ زمین ہل جاتی تھی۔ روزانہ مار کھانے کے بعد قمّا مسلسل سوچتا، آخر اس کی مخبری کرنے والا کون ہے؟ چھ ماہ تک رینجر نے قمّے سے اُگلوانے کا ہر حربہ استعمال کیا۔ شلوار میں چوہے چھوڑے گئے، اُلٹا لٹکایا گیا، پانی میں غوطے دیے گئے۔ اور مار تو اتنی دی کہ خود رینجر والوں کو اس پر ترس آنے لگا۔ جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو شراب کا کیس بنا کر اسے منڈی احمد آباد تھانے بھیج دیا گیا۔ لیکن ان چھ ماہ کے دوران قمّا جسمانی اور دماغی طور پر بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ کیونکہ رینجر کے خوف سے ایک تو گاؤں میں سے کسی نے آ کر اُس کی خبر نہ لی اور دوسرا یہ کہ اُس کا بھائی جلال دین رینجر کی مار برداشت نہ کرتے ہوئے چار ماہ پہلے مر گیا۔ قمّے کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ اسے منڈی احمد آباد تھانے میں چھ ماہ تک رکھا گیا، اور ہلکی پھلکی دوائیاں بھی دیتے رہے مگر بخار نہ اُترا۔ آخر ایک دن تھانے دار نے اسے بلایا اور تھوڑی بہت سرزنش کر کے چھوڑ دیا۔

حوالات سے نکلتے ہی اس نے ہلکی سی انگڑائی لی اور تھوڑی دیر کے لیے تھانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ کیکر کے تنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ یہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی دوپہر تھی۔ اس کے اوپر کوئی کپڑا بھی نہ تھا۔ ہوا کی ایک سرد لہر اس کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ منڈی احمد آباد کے تھانے سے اس کا گاؤں بائیس کلومیٹر دور تھا۔ اس نے باجرے کے کھیت کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ بخار سردی کی وجہ سے زیادہ تیز ہوتا گیا اور سر میں شدید درد بھی ہونے لگا، لیکن وہ چلتا گیا۔ رات ایک بجے کے قریب اُسے ایک چکر سا آیا اور وہ گر پڑا۔

صبح سات بجے شریف حسین نے قمّے کے بیٹے طفیل کو بتایا کہ تیرا باپ خربوزوں کے کھیت میں بے ہوش پڑا تھا، میں بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا تو وہ اُس وقت سے کچھ اُلٹی سیدھی مار رہا ہے۔ اس نے ہمیں پہچانا بھی نہیں۔ خدا خیر کرے، مجھے تو لگتا ہے کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے۔ اسے بہت تیز بخار بھی ہے۔ لگتا ہے بخار اس کے سر کو چڑھ گیا۔

یہ ۱۹۹۸ء کی بات ہے۔ قمّے کو پاگل ہوئے اٹھارہ سال ہو گئے۔ شروع شروع میں تو بہت علاج کرایا۔ گاؤں کے حکیم کے دیسی نسخوں سے لے کر پیر چراغ شاہ کے تعویذ آزمائے۔ مگر پاگل پن بڑھتا ہی گیا۔ اس عرصے میں وہ کبھی کبھی تندرست بھی ہو جاتا مگر یہ حالت چند دنوں سے زیادہ نہ رہتی۔ پچھلے دس سال سے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی ٹھیک نہ ہوا۔ اب اس نے گاؤں والوں کو گالیاں بھی دینا شروع کر دیں۔ جو سامنے سے گزرتا اسے بیہودہ گالیاں دیتا۔ رفتہ رفتہ حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ لوگوں کو ڈھیلے اٹھا کر مارنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر لوگ اس سے کترا کر گزرنے لگے۔ ادھر یہ ان کی اس حرکت سے مزید اشتعال میں آ کر گالیاں دیتا ہوا پیچھے بھاگنے لگا، جسے لوگوں نے کچھ عرصہ تو برداشت کیا، مگر اب وہ تنگ آ گئے اور قمّے کے بیٹے کو شکایتیں آنے لگیں۔ جب شکایات شدت اختیار کر گئیں تو ایک دن طفیل نے قائم دین کو ایک چھوٹی سی زنجیر سے اُسی کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تا کہ گھر سے نہ نکلے۔ قائم دین دو تین دن تو اسی حالت میں رہا، مگر ایک رات چارپائی سمیت باہر نکل کر گاؤں کے چوک میں بیٹھ گیا اور پھر وہی گالیاں دینے لگا۔ یہ دیکھ کر طفیل نے اس کی چارپائی گھر میں کھڑے بیری کے درخت سے باندھ دی۔ اب قائم دین گھر کے افراد کو سارا سارا دن کوستا اور زنجیر پٹختا رہتا۔ یوں دو تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن خدا جانے کیسے زنجیر ٹوٹی اور قائم دین آزاد ہو گیا۔ طفیل گھر پر نہیں تھا۔ عورتوں سے پکڑا نہ گیا۔ وحشت عروج پر تھی۔ شام تک کئی ایک کو زخمی کر دیا اور بہت سوں کو بیہودہ گالیاں دیں۔ گاؤں میں بہت ہنگامہ ہوا۔ کم بخت نے ارشاد علی کی بیٹی کو تو ایسی اینٹ ماری، بیچاری سیدھی ہسپتال جا پہنچی۔ دوئم، مسجد میں گھس کر تمام نمازیوں کے سروں پر خاک ڈال دی اور جوتے اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیے۔ اُس کی اس حرکت سے طفیل عتاب میں آ گیا۔ مولوی صاحب نے برا بھلا کہا۔ چودھری عاشق علی نے طفیل کو بلا کر کہہ دیا، ''اگر تمھارے باپ نے آئندہ کوئی ایسی حرکت کی تو گاؤں سے اپنا بستر گول کر جانا۔ بڈھے نے بیس سال سے سب کو پاگل بنا رکھا ہے۔ یا تو اسے باندھ کے رکھو ورنہ زہر دے کر قصہ پاک کرو، تا کہ روز کی چخ چخ سے جان چھوٹے۔''

لہٰذا طفیل نے قائم دین کو اب جو زنجیر ماری، وہ ایک مست ہاتھی کے لیے بھی کافی تھی۔ اس نے آتے ہی لوہار سے پندرہ کلو لوہے کی ایک زنجیر اور دو کلو کا دیسی تالا بنوا کر قائم دین کو بیری کے موٹے تنے سے باندھ دیا۔ پاس ایک چارپائی رکھ دی کہ چاہے تو چارپائی پر لیٹ جایا کرے، ورنہ زمین تو ہے ہی۔ قائم دین کی بہو صبح شام کھانا اُس کے سامنے رکھ دیتی کہ وہ سگی بھتیجی بھی تھی۔ کوئی اور نزدیک جاتا تو وہ کھانا بالکل نہ کھاتا تھا۔ قائم دین کو اس زنجیر سے بندھے آج چھ ماہ ہو چکے تھے۔ بائیں ٹخنے پر گہرے زخم واضح دکھائی دینے لگے۔ دو سال سے بہو برابر صبح شام اس کا گند بھی صاف کرتی۔ یہ اس کے معمول میں شامل تھا۔

پچھلے اکیس برسوں میں بیری کا درخت اس قدر پھیل گیا کہ پورے احاطے کو اپنے گھیرے میں لے آیا۔ ہری بھری لچکیلی شاخوں پر گلہریاں اور طوطے چڑیاں چہکتیں رہتیں۔ بعض اوقات قائم دین کے سر پر بھی آ کر بیٹھ جاتیں اور چوں چوں کا شور اس قدر بلند کرتیں کہ قائم دین کی پوری توجہ اُدھر ہو جاتی۔ اب وہ سارا سارا دن بیری کی شاخوں پر پُھدکتی گلہریوں، رس چوستی شہد کی مکھیوں اور ہرے پتوں کے درمیان چہکتی چڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ آہستہ آہستہ اُن سے اتنا مانوس ہو گیا کہ کسی اور طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ اب گالی دینا تو الگ بات، اس نے بولنا ہی بند کر دیا۔ بس ٹک ٹک بیری کی شاخوں کو دیکھتا اور چہکتے ہوئے پرندوں میں ہی مگن رہتا۔

غالباً بیس جون ۱۹۹۹ء کا دن تھا۔ طفیل اپنی بیوی کے ساتھ حجرہ شاہ مقیم فوتگی پر گیا ہوا تھا۔ وہ قائم دین کی ذمے داری اپنے پڑوسی نذیرے کو سونپ گیا، کیونکہ اُسے حجرے میں دو چار دن لگ جانے تھے۔ انھی دنوں یہ خبر اُڑی کہ ہندوستان نے ستلج کا پانی چھوڑ دیا ہے۔ خبر اس وقت پہنچی جب پانی بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اس خبر نے سارے ٹھاڑ میں ہراس پھیلا دیا، پھر بھی ٹھاڑ والوں کے پاس بچنے کے لیے کچھ وقت تھا۔ لوگوں کو بتیس سال پہلے کا سیلاب یاد تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی اپنے بوریے بستر لپیٹے اور بند کی طرف بھاگے۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ جو وقت ملا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ہر ایک چیز بچا لے جائیں۔ لہٰذا ہر آدمی کام میں اس قدر مصروف تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ جسے دیکھو اپنا سامان گڈ[1] اور چھکڑوں پر لادے بند کی طرف بھاگا جاتا ہے۔ مکانوں کی چھتوں سے شہتیر نکال لیے گئے اور ایک ایک چیز سمیٹ لی گئی۔ نذیرے نے بھی جلدی سے اپنا سامان باندھا۔ وقت بہت کم تھا جبکہ پانی تیز رفتاری سے ٹھاڑ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے تمام مویشی اور سامان دو تین چکر میں بند پر پہنچا دیے۔ اتنے میں پانی گھر میں داخل ہو کر ٹخنوں سے اوپر اُٹھنے لگا۔ طفیل کو جب سیلاب کی خبر ہوئی تو وہ جلدی سے منڈی احمد آباد آنے والی بس پر بیٹھا تاکہ وقت پر پہنچ سکے۔ وہ منڈی احمد آباد پہنچا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اگلا رستہ اس نے پیدل طے کرنا تھا، کیونکہ ان علاقوں میں بس یا تانگے وغیرہ نہیں جاتے تھے۔ اُدھر گاؤں میں پانی گھٹنوں سے اوپر آ چکا تھا۔ شام چھ بجے تک دریا نے بچی کھچی دیواریں اور مکان بھی برابر کر دیے۔ قائم دین کی چارپائی پانی میں ڈوب چکی تھی، لیکن وہ بے فکری سے پریشانی میں دوڑتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے میں مگن تھا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔ لوگ قائم دین کو زنجیر سے بندھا ہوا دیکھتے اور گزر جاتے۔

نذیرے نے بند پر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا اور سوچا، شکر ہے، ہر چیز سلامت پہنچ گئی۔ مگر اچانک اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے خیال آیا کہ طفیل نے قائم دین کی ذمے داری مجھ پر ڈالی تھی۔ مگر افراتفری میں کچھ یاد نہ رہا۔ اس نے چاہا کہ واپس گاؤں جائے، مگر پانی کے شور اور اندھیرے سے ڈر گیا۔ سوچنے لگا پانی تو بہت بلند ہو چکا ہے اور زنجیر کی چابی بھی میرے پاس نہیں، لہٰذا اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

پانی جب قائم دین کے گھٹنوں سے اوپر اٹھا تو وہ بیری کے تنے سے لپٹ گیا اور بیری پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن پاؤں میں بندھی زنجیر رکاوٹ بن گئی۔ طفیل ابھی تک آٹھ کلومیٹر اپنے گھر سے دور تھا۔ کبھی بھاگتا اور کبھی چلتا، مگر اتنا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کرنا آسان بات نہ تھی، جبکہ ٹھاڑ میں پانی بھی گھٹنوں سے اوپر ہو چکا ہو۔ رات نو بجے کے قریب پانی جب قائم دین کے کاندھوں تک پہنچا تو اس نے شدت سے اپنے پاؤں جھٹکنے شروع کیے۔ کبھی ہاتھوں سے زنجیر کھینچتا اور زور سے ہاتھ پاؤں مارتا۔ کبھی بیری پر چڑھنے کی کوشش کرتا لیکن پھر زنجیر آڑے آ جاتی۔ آخر ستر سال کا بڈھا پندرہ کلو وزنی لوہے کی زنجیر سے کہاں تک زور آزمائی کرتا، نڈھال سا ہو گیا اور جس قدر اوپر اُٹھ سکتا تھا، اُٹھ کر بیری کے تنے سے چمٹ گیا۔ مگر پانی تھا کہ تھوڑی دیر بعد مزید بلند ہو جاتا۔ اب قائم دین کوئی پانچ فٹ کی بلندی تک زنجیر سمیت بیری کے تنے سے چمٹا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اس قدر وزنی زنجیر کو اٹھا کر چھپکلی کی طرح مسلسل چمٹے رہنے سے شل ہو گئے۔ اس پر ستم یہ کہ پانی نے اپنی سطح اور بلند کر لی۔ رفتہ رفتہ پانی اتنا بلند ہو گیا کہ قائم دین غوطے کھانے لگا۔ وہ بار بار زنجیر سے پاؤں پٹختا اور غوطے کھاتا رہا۔ مگر سب کچھ بے سود تھا۔ اندھیری رات میں سوائے پانی کے اُسے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہاں تک کہ رات دس بجے اچانک پانی کا پہلا گھونٹ اُس کے منہ میں داخل ہوا۔ پانی اس قدر زیادہ تھا کہ قائم دین سانس نہ لے سکا۔ بے بسی کے عالم میں اُس کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی جس کی آواز سے پورا ٹھاڑ سہم گیا۔ پھر پانی کے اندر کچھ دیر تک ایک بھرپور ہلچل ہوئی، پھر ایک خاموشی چھا گئی۔ طفیل ابھی تک اپنے گاؤں سے چار کلومیٹر دور تھا۔

۱۔ گڈ: لکڑی سے بنی ہوئی ایک قسم کی گاڑی جس کے پہیے بھی لکڑی کے ہوتے ہیں۔

تابوت

مجھے دیکھتے ہی آفتاب بولا ''یار علی دو منٹ پہلے آجاتا تو کیا اچھا تھا۔ اس کمینے نے آج مجھے تیسری دفعہ مات دی۔ یہ اتنا بڑا سور ہے۔۔۔'' اگلا لقمہ ڈاکٹر نے اچک لیا:۔۔۔ ''کہ ایک کتے سے قابو نہیں آتا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر منور بیگ ہم دونوں کی نسبت اچھا شاطر تھا، پھر بھی میں اور آفتاب مل کر اس پر حاوی ہو جاتے۔ منور بیگ کا کلینک گاؤں کے چوک میں واقع تھا جس کے ایک طرف جامع مسجد تھی اور سامنے پکی اور صاف ستھری سڑک گزرتی تھی جس پر ٹریفک بالکل نہ تھا مگر سارا دن اکا دُکا آدمی ضرور گزرتے رہتے۔ سڑک کے دوسری طرف پارک تھی جس میں کھجور کے چھ سات اونچے درخت بھی تھے جو دیکھنے والے کو بھلے لگتے۔ سڑک اور پارک دونوں ویران تھے۔ غالباً گاؤں کے لوگوں کا ایسی چیزوں میں دھیان نہیں رہتا۔ میرا اور آفتاب کے دن کا بڑا حصہ کلینک پر ہی گزرتا۔ ڈاکٹر اچھا شاطر ہونے کے علاوہ حاضر جواب اور بذلہ سنج آدمی تھا۔ اس سے بات کر کے آسان نکل جانا مشکل تھا۔ ہر فن مولا ایسا کہ گھر کا چولہا بنانے سے لے کر مریضوں کی دوائیاں تک خود تیار کر لیتا۔

آفتاب کے پاس امریکہ کا گرین کارڈ تھا۔ گرمیوں میں چلا جاتا، چھ سات مہینے مزدوری کرتا، اور نومبر چڑھے لوٹ آتا۔ پچھلے بیس سال سے یہ اس کا معمول تھا۔ سرطان کا مریض بھی تھا، لہٰذا ڈاکٹروں نے اسے سگریٹ منع کیے ہوئے تھے۔ گھر سے باہر آتا تو بیگم چھوٹا لڑکا ساتھ کر دیتی کہ ابا کا خیال رکھے اور سگریٹ پینے پر اسے خبر کرے۔ اِدھر اس نے بچے کو رشوت پر لگا دیا کہ ہر سگریٹ کے پانچ روپے لے لیا کرے مگر اپنی امی کو نہ بتائے۔

ہم آفتاب سے اکثر امریکی معاشرے پر بات کرتے، جس پر وہ مزے لے لے کر سناتا کہ ایک دفعہ فلاں سے عشق کیا تو یہ گزری، فلاں سے عشق ہوا تو یہ بیتی۔ ہمیں بتاتا کہ امریکیوں کا دل اتنا کھلا ہے کہ ایک لڑکا جو میرے ساتھ کام کرتا تھا اسے میں نے کہا، یار تمھاری بہن کیا غضب کی خوبصورت ہے۔ بولا، آپ کی اس سے بات کراؤں؟ میں نے کہا، نیکی اور پوچھ پوچھ کر، بھلائی میں دیر کیسی؟ میاں جلدی کرو۔ لیکن پتہ چلا کہ پہلے ہی اس کا ایک بوائے فرینڈ ہے۔ جس کا ہم دونوں کو بہت افسوس ہوا۔

امریکی قانون پر بات کرتے ہوئے اس نے کہا، ''قانون سخت ہے لیکن امریکی ڈاکو اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔'' میں نے پوچھا، ''اُدھر کبھی لٹنے کی سعادت حاصل ہوئی؟'' بولا، ''مجھے کسی نے نہیں لوٹا، البتہ ان کے ہاتھوں فائدہ ہوا۔ قصہ یہ کہ میں ایک پٹرول پمپ پر ملازم تھا۔ میرے پاس پٹرول کے تقریباً چار ہزار ڈالر جمع ہو گئے تھے کہ اتنے میں ڈاکو آ گئے۔ انھوں نے تمام افراد کو لوٹ لیا۔ خوش بختی سے میں پیسوں سمیت ٹائلٹ میں جا گھسا۔ ڈاکو چلے گئے تو باہر نکل آیا اور لٹنے والوں میں شامل ہو گیا۔ افراتفری میں کسی کو پتہ نہ چلا۔ یوں میں اس رقم کا مالک بن گیا۔ اس دن، خدا کی قسم، مجھے پاکستانی ہونے پر فخر ہوا۔''

ایک دن حسب معمول ہم شطرنج اور چائے میں مشغول تھے کہ ایک مریضہ کو اس کے لواحقین تانگے پر لاد کر لائے۔ مریضہ بے ہوش تھی اور لواحقین گھبرائے ہوئے۔ ڈاکٹر نے شطرنج جلدی سے میز کے نیچے چھپا دی اور مریضہ کو دیکھنے لگا۔ میں اور آفتاب اٹھ کر باہر آ گئے اور پارک میں آ کر کھجوروں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ مریضہ نے کام خراب کر دیا ورنہ اس گیم میں ڈاکٹر پھنس گیا تھا۔ ڈاکٹر منور بیگ کچھ دیر مریضہ کو دیکھتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں غالباً کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر پریشانی کے عالم میں اس نے لواحقین کو جواب دے دیا۔ ان سے کہا کہ مریضہ کو دل کا زبردست اٹیک ہوا ہے اسے جلدی سے شہر لے جاؤ۔ ڈاکٹر کے جواب دینے پر لواحقین گھبرا گئے۔ وہ اس گومگو کی کیفیت میں تھے کہ اتنی جلدی کیا کیا جائے۔ مریضہ کو دوبارہ تانگے پر رکھا گیا۔ تانگا چلنے ہی کو تھا کہ آفتاب نے بھاگ کر مریضہ کی نبض پکڑ لی، پھر ڈاکٹر کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر نے پاس آ کر مریضہ کو دوبارہ دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس کیفیت میں میں دور ہی کھڑا رہا۔ غالباً یہ میری نفسیاتی کمزوری ہے کہ کسی کی تکلیف کو قریب سے نہیں دیکھ سکتا۔ خیر، ڈاکٹر اور آفتاب کو پریشان دیکھ کر ورثا سمجھ گئے اور دہاڑیں مار کر رونے لگے۔ دراصل مریضہ فوت ہو چکی تھی۔ کچھ راہ چلتے بھی کھڑے ہو گئے اور دلاسے دینے لگے۔ بہر حال، پانچ چھ منٹ میں تانگا رخصت ہو گیا اور دس منٹ کے اندر لوگ بکھر گئے، یہاں تک کہ ہم تینوں رہ گئے اور سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

کچھ توقف کے بعد ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور بولا، ''کیوں علی صاحب، بندہ کس صفائی سے مرتا ہے؟'' میں چپ رہا مگر آفتاب نے سامنے سڑک کے اس پار پارک میں بارش کے پانی میں تیرتی بطخوں کو دیکھتے ہوئے کہا، ''کم از کم مجھے اس طرح کا مرنا پسند نہیں۔ یہ کیا کہ مریض کو پتہ بھی نہ چلے اور وہ مر جائے، وہ بھی سڑک کے عین بیچ۔ امریکہ میں انسان اور حیوان دونوں ہسپتال میں مرتے ہیں اور اس صفائی اور آرام سے کہ تکلیف کا احساس نہیں رہتا۔ یوں تانگوں میں ذلیل نہیں ہوتے۔''

اس بات پر منور بیگ نے سرد آہ کھینچی اور میں نے فقط سر ہلا دیا۔

ہمیں متاثر ہوتے دیکھ کر وہ مزید بولا، ''بس یار، زندہ رہنے کا، مرنے کا اور مرنے کے بعد تک کا مزہ امریکہ میں ہے۔ یہاں تو (ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے) نیم حکیم ہیں، تانگے ہیں یا جوہڑ کے گندے پانی جن میں بطخیں تیرتی ہیں۔'' میں نے کہا، ''اگر جینے مرنے کا مزہ امریکہ میں ہے تو بالکل ہی اُدھر کیوں نہیں چلا جاتا؟ اِدھر کیا رکھا ہے؟'' بولا، ''سوچا تو میں نے بھی ہے، لیکن میری دو بیٹیاں ہیں۔ سوچتا ہوں، گوروں سے آنکھ لڑا بیٹھیں تو کیا ہو گا؟ اور قانون یہ ہے کہ والد تھپڑ مارے تو جیل جائے۔ البتہ ان کو بیاہ کر جاؤں گا اور پھر نہ آؤں گا۔'' اس گفتگو نے ہماری افسردگی دور کر دی اور ہم یہ بھی بھول گئے کہ ابھی ابھی ہمارے سامنے کسی کی موت واقع ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے آفتاب کو پھر چھیڑا۔ ''یار، یہ تو پتہ چل گیا کہ جینے اور مرنے کا مزہ مغرب میں ہے، لیکن مرنے کے بعد تک کے مزے سے تمھاری کیا مراد ہے؟ یعنی یہ کہ امریکی خدا سے بھی ہاتھ کر

گئے اور جنت بھی لے اڑے؟''

آفتاب میری طرف دیکھ کر ہنسا۔ پھر بولا ''جہاں تک جنت کا سوال ہے، امریکی تو ایک طرف، ہم بھی فارغ ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ کھاتے ہوٹل میں ہیں، رہتے ٹھنڈ میں، مرتے ہسپتال میں اور دفن تابوت میں ہوتے ہیں۔ جبکہ یہاں کھاتے کچھ نہیں، مرتے سڑکوں پر ہیں اور دفن نہیں ہوتے بلکہ دابے جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے کہا ''کیا تابوت مٹی میں نہیں جاتا؟''

''جاتا ہے، مگر تو نے تابوت نہیں دیکھا'' آفتاب کہنے لگا۔ ''ایک اعلیٰ پائے کی لکڑی کا صندوق جس کے اندر ایلومینیم کا ایک اور صندوق، اس کے اندر شاندار کپڑا، جاڑے اور گرمی میں مردے کا محافظ۔ بندہ صدیوں سوتا ہے اور مٹی کا منہ چڑاتا ہے۔ مجال ہے کفن کا تار بگڑے۔ اور یہاں؟ خدا کی پناہ، مذہبی فوجدار، غسال اور گورکن مردے سے گویا انتقام لیتے ہیں۔ ایک تو وہ بیچارہ مرتا ذلت سے ہے، اور رہی سہی کسر یہ نکالتے ہیں۔ چھ فٹ گہرا گڑھا کھودا، زمین پر چت لٹایا اور اوپر مٹی بھر دی۔ یعنی لاش اگر کل خراب ہونی ہے تو آج ہی ہو جائے۔ گرمیوں میں پسینے چھوٹیں اور سردیوں میں جاڑا مار دے۔ بھائی، میرا تو یہاں مرنے کو دل نہیں کرتا۔ جہاں تابوت نہیں وہاں بندہ کیا خاک مرا، بلکہ ذلیل ہوا۔''

''بس کرو میاں،'' ڈاکٹر کہنے لگا ''ہمیں تو افسوس ہوتا ہے کہ ابا انگریز کیوں نہ ہوئے۔ کاش امریکی ہوتے، چاہے موچی ہوتے۔ اب تابوت سے بھی رہے اور خوف آنے لگا ہے کہ ابھی مرے، ابھی خاک ہوئے۔ بھائی، اب کے جاؤ تو دو تابوت بھجوا دینا، ہم پر احسان ہوگا۔'' اسی چھیڑ چھاڑ میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ میں اور آفتاب اٹھ کر چلے آئے۔

دوسرے دن میں کسی ملازمت کے حصول کے سلسلے میں شہر چلا گیا۔ وہاں دو ماہ رہا۔ اس دوران ڈاکٹر اور آفتاب سے ملاقات نہ ہو سکی، البتہ دو چار بار فون پر بات ضرور ہوئی۔ ملازمت چونکہ اچھی نہ تھی اور دوسری وجہ یہ کہ گاؤں یاد آنے لگا، لہٰذا جلد ہی لَوٹ آیا۔ چار بجے کلینک پر گیا تو دونوں گپیں ہانک رہے تھے۔ میرے جاتے ہی منور بیگ نے بساط پر مہرے لگا دیے۔

کھیل کے دوران ڈاکٹر بولا ''چلو یار، آج تمھیں جان بوجھ کر جتوا دیتا ہوں کیونکہ کل آفتاب چلا جائے گا۔ کیا کہے گا، جاتے جاتے بھی ہار گیا۔''

میں نے کہا ''بعض لوگ جا کر بھی ہار جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر کہنے لگا ''یہ لوگ (آفتاب کی طرف اشارہ کر کے) نہایت کمینے ہیں، ہار کر بھی کچھ نہ کچھ لے اڑتے ہیں۔''

''اور آپ سیّد زادے ہیں،'' آفتاب نے شاہ کو شہ دیتے ہوئے کہا ''کہ ہر طرف عنایات کی بارش ہے۔''

''بھڑوے، تجھے شاطر کر دیا۔ سگریٹ، چائے اور کھانسی ہمارے لطف کا نتیجہ ہے،'' ڈاکٹر ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہماری صحبت میں ہی بیٹھنے سے تمھیں عقل آئی۔ اب لوگ تجھے اچھا بھلا دانشور سمجھتے ہیں۔ گویا اب تُو چلتا پھرتا کامریڈ ہے۔'' اس پر آفتاب ڈاکٹر کو ٹک ٹک دیکھنے لگا۔

یوں ہم سارا دن ہنستے رہے جبکہ گاہے گاہے ڈاکٹر مریض بھی دیکھتا رہا۔ دوسرے دن ہم آفتاب کو ایر پورٹ پر چھوڑ آئے کیونکہ یہ اس کا امریکہ جانے کا دن تھا۔

آفتاب کے جانے کے بعد میں اور ڈاکٹر گاؤں میں ہم مجلس رہ گئے۔ چار پانچ دن بعد آفتاب کا فون بھی آ جاتا اور کافی دیر تک ہماری باتیں ہوتی رہتیں۔ ڈاکٹر فون پر ہی اس کی اچھی بھلی خبر لے لیتا۔ دو ماہ اسی طرح نکل گئے۔ مگر پچھلے کوئی بیس دن سے اس کا فون نہ آیا۔ ہم تھوڑے سے پریشان ہوئے کہ ایسا بے مہر آدمی تو نہ تھا، خدا جانے کیا بنی۔

ایک دن میں نے آفتاب کے بیٹے شہزاد سے پوچھا ''تیرے ابا کا فون نہیں آیا؟'' اس نے کہا ''وہ اُدھر ہسپتال میں داخل ہیں۔ آج پندرہ دن ہو گئے، تکلیف اور بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ وہ بات نہیں کر سکتے۔'' یہ بتاتے ہوئے وہ رو پڑا۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور ڈاکٹر کو آ کر بتایا۔ لہٰذا اس دن ہم باتیں ہی کرتے رہے۔ شطرنج کھیلنا ویسے ہی بھول گئے۔

پارک میں کھڑا بارش کا پانی اب خشک ہو چکا تھا اور بطخوں کی جگہ آوارہ کتوں نے لے لی تھی جو ایک دوسرے پر غرا رہے تھے۔

اگلے دن رات کوئی ساڑھے گیارہ کا عمل ہوگا، اعلان ہوا کہ آفتاب جو امریکہ میں کسی ہسپتال میں داخل تھا، آج رات نو بجے فوت ہو گیا۔ میں دوڑ کر آفتاب کے گھر کی طرف گیا۔ ڈاکٹر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ آفتاب کے بیوی بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھر میں داخل ہوئے تو آفتاب کے بچے ہم سے لپٹ گئے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ ہمارے پاس دلاسا دینے کو الفاظ نہ تھے۔ فقط آنسو نکل آئے۔ دوسرے دن آفتاب کے بھائی اور رشتے دار بھی آ گئے جن میں سے ایک ملک کا مشہور فلمی ایکٹر بھی تھا۔ تیسرے دن لاش آ گئی۔ جسے دیکھ کر ہم ایک دم چونک گئے۔

لاش ایک بڑے اور خوبصورت تابوت میں تھی۔ میں اور ڈاکٹر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مگر چپ رہے۔ لاش آنے پر پورا گاؤں امڈ آیا۔ جونہی تابوت کھولا گیا، ایک کہرام مچ گیا۔ رونے کی آوازیں دردناک تھیں۔ اس کے بیوی بچے لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ ہم پر بھی رقت طاری ہوگئی اور آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ فضا اس قدر بوجھل اور ماحول ایسا دردناک تھا کہ ہم زیادہ دیر تک لاش کے قریب نہ ٹھہر سکے۔ علاوہ ازیں، رفتہ رفتہ عورتوں کا ہجوم بڑھنے لگا تھا۔ لہٰذا ہم لاش سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور تعزیت میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگے، جو پلٹتے ہوئے تابوت کا ذکر ضرور کرتے کہ کتنا خوبصورت اور چاندی سے زیادہ سفید ہے۔ عورتیں اس کے اندر کے کپڑے پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

نوجوانوں اور بچوں کا الگ ہجوم فلمی اداکار کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ وہ اتنے بڑے فلم اسٹار کو پہلے سکرین پر ہی دیکھتے رہے تھے لیکن آج اسے عین آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ آفتاب کی لاش سے انھیں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ اس کی موت نے انھیں یہ موقع فراہم کیا۔

اِدھر آفتاب کے بھائیوں اور رشتے داروں کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کی وجہ سے امریکی تابوت اور معروف اداکار کو لوگ دیکھ سکے۔ اس عالم میں آفتاب کے بیوی بچے ہی صرف وہ لوگ تھے جنھیں تابوت دکھائی نہ دیا، خاص کر پانچ روپے رشوت لینے والے بیٹے کو، جو بالکل لاش کے اوپر لیٹا چیخ رہا تھا۔

شام چار بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ پڑھا گیا تو لوگوں نے باری باری آفتاب کا چہرہ دیکھا۔ جب تمام لوگ چہرہ دیکھ چکے تو آفتاب کا بڑا بھائی ارشد اچانک کھڑا ہو گیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا، ''اے گاؤں والو! تابوت چونکہ ہر ایک کو بہت پسند آیا ہے، لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تابوت گاؤں والوں کو دے دیں تاکہ وہ اپنے مرنے والوں کو اس میں ڈال کر قبرستان لے آیا کریں، اور آفتاب کو بغیر تابوت کے دفن کرتے ہیں۔'' ارشد کے اس اعلان پر تمام لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا اور اسے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا، بلکہ مولوی صاحب نے اس بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمایا، ''ارشد نے بہت

اچھا فیصلہ کیا ہے، کیونکہ ویسے بھی لاش کو ایلومینیم کے تابوت میں دفن کرنا شرعاً جائز نہیں۔ منکر نکیر کو دقت پیش آتی ہے۔'' ارشد کے اس اعلان اور مولوی کے فتوے کی وجہ سے میرے اور ڈاکٹر کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر ان کا منہ نوچ لیں مگر ایسا نہ کر سکے۔

خیر، جنازہ پڑھنے کے بعد اکثر لوگ چلے گئے، چند ایک رُکے رہے۔ یہاں تک کہ تابوت کو قبر کے نزدیک لے جا کر کھولا گیا۔ تین لوگوں نے مل کر آفتاب کی لاش باہر نکالی۔ دوسرے لوگوں نے کلمۂ شہادت بلند کیا۔ اس کے بعد دو شخص قبر میں اترے اور کلمۂ شہادت کے ورد کے ساتھ قبر میں اسے ننگی زمین پر لٹا دیا۔ پھر مٹی ڈالی جانے لگی۔

اس تمام عمل کے دوران میں اور ڈاکٹر تماشا بنے کھڑے رہے۔ ہم نے نہ تو کلمۂ شہادت پڑھا، نہ لاش کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی مٹی ڈالی، جیسے مرنے والا کوئی اجنبی ہو۔

شہابو خلیفہ کا شک

سیالکوٹ سے پیر مست کی روانگی کی خبر کیا آئی، پورے علاقے میں میلے کا سماں بندھ گیا۔ پچھلے برس کا شکار لوگ کیسے بھول جاتے؟ نگاہوں میں پیر مست کے کتے اور اُن کی طرّ اریاں پھرنے لگیں۔ گھر آنگنوں اور چوراہوں میں کتوں کے تذکرے چھڑ گئے۔ جہاں دو لوگ اکٹھے ہوئے، پیر مست کے کتے زیر بحث آئے۔ عصر کے بعد تولڑ کے بالوں سے لے کر بڑے بوڑھوں کی ٹولیاں جگہ جگہ اسی ذکر سے روشن ہو جاتیں۔

''میاں کتے کیا ہیں، چیتے ہیں چیتے۔ یوں ایک قدم اٹھا اور پندرہ گز سمیٹ لیے،'' ایک بولا۔

''لو اور سنو! بھائی، وہ تو چلتی پھرتی موتیں ہیں۔ چیتا بیچارا کیا جانے کہ شکار کیسے کرتے ہیں؟ پچھلے سال تُو نے دیکھا نہیں،؟ پیر مست کے کالے نے ٹیلے سے اُترتے ہی خرگوش پر کیسی جھپٹ ماری،'' دوسرا کہنے لگا۔

''ہاں! واہ بھئی، مزہ آ گیا تھا۔ ایسی اونچی چھلانگ! میاں خدا جھوٹ نہ کہوائے، کالا پانچ منٹ تک تو ہوا میں ہی رہا، پھر جو ایک پنجہ دیا، خرگوش بیچارا بیں بھو مالیاں کھا گیا۔ اور ابھی حواس مختل ہی تھے کہ آنتیں چیتل کے منہ میں تھیں۔ بس جی، جہاں چیتل اور کالا پہنچ گئے، پھر وہاں ملک الموت کی عزت تو خاک میں گئی،'' دلاور بول اٹھا۔ ''بیچارا ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے کہ شکار کی جان اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی کتے نکال لیتے ہیں۔''

غرض جدھر سے گزرتے، پیر مست اور اس کے دونوں کتوں، کالے اور چیتل، کی گفتگو ہو رہی ہوتی۔ ایک دفعہ تو اسی گفتگو میں بحث اور پھر سر پھٹول تک بات جا پہنچی۔ ہوا یہ کہ خیر محمد بھنگ پیے ہوئے تھا، اور اسی ترنگ میں اس نے کہیں شاہ دین کے فائٹر کی تعریف کر دی۔ اب بھلا یہ کوئی موقع تھا فائٹر کا نام لینے کا؟ کہاں پیر مست کا چیتل اور کہاں شاہ دین لنگڑے کا فائٹر! گویا شیر بکری کو ملا دیا۔ نور خاں کے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھے تمام لوگوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ حیات خاں کا تو خون ہی کھولنے لگ گیا۔

''او شاہ دین کے چڑے! تو نے سمجھا کیا ہے فائٹر کو؟ وہی جو مرغی کو دیکھ کر بھاگ اٹھتا ہے؟ اس سے تو نظام دین کی بکری دلیر ہے،'' ایک طرف سے شامو فوجی بولا، جو فوج سے بھگوڑا ہوا تھا۔

''واہ بھئی واہ شامو! شاہ دین کے فائٹر کو بکری سے مقابل کرنا آپ ہی کے لائق ہے!'' جلال احمد کہنے لگا۔ ''یوں کہو، جیسا گیدڑ شاہ دین ویسا اس کا فائٹر۔''

بس اسی پر شاہ دین کے بھانجے کو طیش آ گیا۔ اُس نے وہیں الٹے ہاتھ سے جلال کے سر پر گنّا جما دیا۔ پھر کیا تھا، کیا جوتے اور کیا لکڑیاں، جو جس کے ہاتھ میں آیا کھینچ مارا، اور پانچ ہی منٹ میں ہر بندہ رنگو رنگ۔ پھر آپ ہی آپ لڑائی بند کر دی کہ یہ ایک فضول کام تھا۔

خیر یہ سب تو ایک طرف، لیکن اگر سچ پوچھیں تو میں کہوں گا، پیر مست کے کتوں کا واقعی جواب نہیں تھا، اس لیے کہ پچھلا شکار میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ڈھائی ڈھائی فٹ اونچے چمکتے ہوئے شکاری نسل کے سیاہ کتے تھے۔ پاؤں میں چاندی کی جھانجھریں اور چاندی ہی کی زنجیریں گلے میں تھیں۔ شکار کے پیچھے دوڑتے تو چھن چھن کی آواز آسمانوں کو چڑھتی سنائی دیتی۔ گوشت اور شکار سے اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ ایک کتے کے زنجیر کو دو آدمی پکڑتے، پھر بھی گھسٹتے چلے جاتے۔ شکار کے وقت چھلانگ تو ایسی قیامت کی لیتے کہ نظر چکرا جاتی، گویا بجلی کی کوند آنکھوں کے آگے سے نکل گئی ہو۔ جب سے میں نے شکار دیکھا، آئندہ کا انتظار رہا۔ اور اب وہ موقع دوبارہ آ رہا تھا۔

معاملہ دراصل یہ تھا کہ پیر مست جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے دادا نے مٹی کی دیوار پر بیٹھ کر حکم دیا کہ ''چل'' تو دیوار چل پڑی تھی، سیالکوٹ کے گاؤں میں رہتے تھے جہاں ان کی بڑی زمینیں تھیں اور پورے پنجاب میں ہزاروں مرید تھے۔

حضرت صاحب نے دو کتے پال رکھے تھے۔ وہ ہاڑ کے فوراً بعد اپنے قصبے سے پیدل چل نکلتے جس کا ایک مقصد تو شکار کرنا اور دوسرا اپنے مریدوں کے ہاں پھیرا لگانا ہوتا۔ قصبے سے نکلنے سے پہلے ایک آدمی رستے میں پڑنے والے تمام گاؤں کو اطلاع کر دیتا۔ پیر صاحب اپنے قصبے سے دو خلیفوں اور دونوں کتوں، چیتل اور کالے، کے ساتھ نکلتے، شکار کرتے کرتے پیدل ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جا پہنچتے۔ رات وہیں بسر کرتے، اگلے دن وہاں سے چار پانچ مرید مزید ساتھ ہو لیتے۔ یوں جیسے جیسے گاؤں در گاؤں فاصلہ طے ہوتا، قافلہ بڑھتا جاتا اور شکار میں رونق پیدا ہوتی جاتی۔ رات جس گاؤں میں قیام ہوتا وہاں پیر مست اور اُس کے کتوں کی اس طرح خدمتیں ہوتیں کہ لوگوں کو رشک آ جاتا۔ خوب مالشیں کی جاتیں، گرم پانی اور سرف پوڈر سے نہلایا جاتا۔ رات کو پیر مست انھیں اپنے ساتھ سلاتا، ایک کو دائیں اور دوسرے کو بائیں طرف۔ اسی طرح پچھلے گاؤں سے قافلے میں داخل ہونے والے مریدوں کی بھی کافی آؤ بھگت ہوتی۔ چونکہ ہر گاؤں میں پیر مست کے کئی مرید تھے، جن میں بہت سے شکار کے شوقین بھی تھے، لہٰذا ہمارے گاؤں پہنچنے تک قافلہ سینکڑوں مریدوں پر مشتمل ہوتا۔ اب جوں جوں ہمارے گاؤں میں پیر مست کے داخل ہونے کے دن قریب آ رہے تھے، جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔

پیر مست ہمارے گاؤں میں دو دن قیام کرتا اور گاؤں کے جنوبی ٹیلوں کو شکار کے لیے منتخب کیا جاتا، جہاں کبھی دریائے بیاس پوری جولانی سے بہتا تھا۔ اب وہاں دور تک آک کے پودے، خاردار جھاڑیاں اور ببول کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ نیز کئی اونچے نیچے ریت کے ٹیلے تھے۔ انھی ٹیلوں اور جھاڑیوں میں خرگوش، سؤر، سیہہ اور اسی طرح کی ہزاروں بلیات پڑی پھرتی تھیں۔ بعض لوگوں کو سانپ وہاں اژدہے بھی نظر آئے۔ غرض شکار کے لیے یہ علاقہ ایک جنت کی حیثیت رکھتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ چیتل اور کالے کے جوہر بھی زیادہ یہیں کھلتے۔

خیر، خدا خدا کر کے ایک شام پیر مست گاؤں میں وارد ہو گئے۔ کوئی دو سو آدمی ڈھول بجانے والے کے ساتھ استقبال کی خاطر باہر نکل آئے۔ آگے آگے پیر مست اور اس کے کتے تھے جن کے پٹوں میں سونے کے کیل جڑے تھے اور چاندی کی لمبی لمبی زنجیریں خلیفوں نے پکڑی ہوئی تھیں۔ پیچھے سو آدمی اور تھے۔ کچھ آدمی ہمارے گاؤں کے بھی ساتھ تھے جو ایک دن پہلے ہی آگے سے جا کر مل گئے تھے۔

جونہی پیر صاحب نزدیک آئے، لوگوں نے بھاگ بھاگ کر پہلے پیر مست کے پاؤں کو بوسے دیے اور پھر کتوں کے منہ سر چومنے لگے۔ اس دھکم پیل میں ہجوم اس قدر بڑھا کہ پیر مست کتوں سمیت بوند لا گئے۔ دوسری طرف ڈھول کی تھاپ اور پٹاخوں کے شور نے سماعت چھین لی۔ بعض گلاب اور چنبیلی کے ہار پیر مست اور کتوں کے گلے میں ڈالنے لگے۔ پھولوں کی پتیاں بکھرنے لگیں۔ جو ہار بچ گئے انھیں خلیفوں کے گلے میں ڈال دیا۔ غرض بڑی دھوم دھام سے پیر مست کو حیات خاں کے چبوترے پر لایا گیا، جہاں چبوترے اور بازار میں دور تک چارپائیاں پہلے ہی بچھا دی گئیں تھیں۔ پیر مست اور اس کے کتوں کی چارپائیاں سامنے ہی تخت کی طرح تھیں، جن میں سے ایک پر پیر مست اور دوسری پر چیتل اور کالا براجمان ہو گئے۔ باقی مجمع سامنے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد تمام لوگوں کی شربت سے تواضع کی گئی، لیکن خاص پیر مست کے لیے صندل تیار کر کے پیش کیا اور کتوں کے سامنے صندل ملے دودھ کا بڑا کٹورا رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد گاؤں والوں کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا، پیر مست کے قدموں میں سر رکھ دیتا۔ پیر مست دو تین بار اسے تھپکی دیتے، پھر وہ کتوں کے منہ اور ہاتھ پاؤں مس کرتا۔ بعض تو کتوں کو چومتے بھی۔ اس کے بعد بڑے ادب سے پچھلی چارپائیوں پر بیٹھ جاتے۔

رات دس بجے تک لوگ یونہی آتے جاتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اچانک پیر مست نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر جلالی انداز سے وعظ شروع کر دیا۔ مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''بس اللہ سے نزدیکی یہی ہے کہ اُس کی مخلوق سے محبت کرو۔ کسی کو تکلیف دینا بڑا عیب ہے، چاہے وہ کتا ہی کیوں نہ ہو۔ محبت تم پر فرض ہے۔ یہی تمھاری نماز ہے اور یہی زکوٰۃ، علاوہ اس کے روزہ نہ صلواۃ۔ بتاؤ مجھے، کہف کے کتے نے کتنی نمازیں پڑھیں؟ بولو، بلعم باعور کے گدھے نے کتنے روزے رکھے؟ (ہلکے سے توقف کے بعد) گئے دونوں جنت میں۔ کتا بھی اور گدھا بھی۔''

خلیفہ جو دائیں طرف کھڑا تھا، اونچی آواز میں پکارا، ''حق ہے سرکار، حق ہے سرکار!''

(کچھ دیر خاموشی کے بعد) ''جو محبت کرے گا جس سے، جائے گا وہ ساتھ اُس کے۔ چاہے بندہ کرے محبت ساتھ بندے کے، چاہے کرے محبت کتا ساتھ بندے کے۔''

حق ہے سرکار، حق ہے سرکار!'' (خلیفہ مکرر بولتا ہے۔)

رات گیارہ بجے تک یونہی وعظ رہا۔ پیر مست کی رعب دار آواز نے پوری محفل کو اپنے سحر میں لیے رکھا۔

اگلے دن جنوبی ٹیلوں کی طرف روانگی ہوئی۔ دس ڈنڈا بردار آگے ہوئے۔ وہ جھاڑیوں پر ڈنڈے مارتے اور عجیب و غریب آوازیں نکالتے، سیٹیاں بجاتے۔ جیسے ہی کوئی خرگوش یا سیہہ نکل کر بھاگتا، کتوں کا کام شروع ہو جاتا۔ پیر مست ''حق مدد ہُو!'' کہہ کر کتوں کی زنجیر کھولنے کا اشارہ کرتا۔ پھر تو ایسا جوش و خروش بڑھتا کہ آنکھوں نے دیکھا ہو تو یقین آئے۔ ایسے ہی جھاڑیوں سے ایک گیدڑ نکل آیا جو سیدھا جھیل کی اور بھاگا، مگر دم کے دم میں چیتل نے آگے سے جا گھیرا۔ بیچارا اُلٹے قدموں ہوا تو کالا آڑے آیا۔ پھر تو کمبخت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا پیر مست کے کندھوں کے اوپر سے چھلانگ مارتا ہوا مشرق کو پھرا۔ اس اچانک حملے سے پیر صاحب ٹیلے سے لڑھکے اور کئی قلابازیاں کھا گئے، مگر ریت کی وجہ سے کوئی خاص چوٹ نہ آئی لہٰذا کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُدھر تماشائیوں کی ہلے بازی اور ہاو ہو نے مزید ہنگامہ کر دیا۔ اِدھر کالا اور چیتل ہوا میں اڑتے ہوئے آگے سے ہو لیے۔ اس افراتفری میں گیدڑ بیچارا ایسا بدحواس ہوا کہ زمین تنگ ہو گئی۔ کبھی اس جھاڑی میں منہ چھپاتا، کبھی اُس جھاڑی میں۔ لیکن آئی کو کون ٹال سکے۔ جب چاروں طرف سے کتوں نے سمیٹ لیا تو بیچارے نے بے بسی سے ایک گھورے میں اپنا منہ ٹھونس دیا۔

جیسے ہی چیتل کے دانت پیٹ میں گھسے، ایک قیامت کی چیخ ایسی بلند ہوئی کہ صحرا تھرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے کالے نے ٹانگوں کو جبڑے میں لے کر باہر گھسیٹ لیا، پھر دو ہی منٹ میں پیٹ کھال سے باہر نکل آیا۔ ساتھ ہی ''حق ہو! مدد غوث!'' کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کے بعد کچھ دیر کتے گیدڑ کی لاش سے شغل کرتے رہے، بالآخر ایک فاتحانہ چال سے پیر مست کی طرف مڑ آئے۔ پیر مست نے باری باری دونوں کو تھپکی دی اور عجیب سرشاری سے مسکرایا۔

غرض سہ پہر چار بجے تک ایک گیدڑ، دو سور، تین خرگوش اور ایک سیہہ کا شکار کیا۔ پھر سارا مجمع کچھ دیر آرام کے لیے ببول اور جھاڑیوں کے سایوں میں بیٹھ گیا، جبکہ دو خلیفے چیتل اور کالے کی مالش کرنے لگے۔ اگرچہ پیر مست پہلے ہمارے گاؤں میں کئی دفعہ آیا، لیکن میں نے یہ شکار دوسری دفعہ دیکھا، اور ایسا دیکھا کہ آنکھوں میں نظارے بند ھ گئے۔ رات دربار جما تو مزے کی گفتگو میں سنیں۔

''پیر جی دیکھا، چیتل نے تیسرے ٹیلے سے کیسی چھلانگ دی!'' ایک خلیفہ بولا۔ ''حضور، میں نے تو سمجھا کہ میرے سر سے ہوائی جہاز اڑ گیا۔ ایک دم شاں کی آواز آئی۔''

دوسرا خلیفہ بولا، ''میری تو جان ہی ہوا ہو چلی تھی۔ دھم سے اوندھا جا گرا۔''

''حضرت، گیدڑ کو آپ سے گستاخی مہنگی پڑی،'' شامو کہنے لگا۔ ''میں دیکھ رہا تھا، جب آپ لڑھکے تو کالے کے تلووں میں جا لگی۔ میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ اب تو گیدڑ کا مشلہ ہو کے رہے گا۔'' شامو کے اس جملے سے پیر مست تھوڑا سا کھسیانا ہوا۔ اُسی لمحے حیات خاں نے شامو کو گھور کے دیکھا۔

''بس پھر بابا جی، آپ نے بھی ایسی قلابازیاں لگائیں کہ ہم تو دنگ ہی رہ گئے،'' شامو نے فوراً ہی لہجہ بدلا۔ ''پہلی بار آپ کی تیزیاں دیکھیں۔''

''ہاں شامو، اگر میں اُسی وقت تیزی نہ دکھاتا تو حرامی کے پنجے آنکھوں میں گھس جاتے،'' پیر مست نے وضاحت کی۔

شیرو چوڑی والا جو ہر واقعے کو منظوم کر دیتا تھا۔ اُس نے گانا شروع کیا۔

ویکھی اج میں نے سگاں کی کمالاں
کالے کی دوڑاں چیتل کی چھالاں
جنگاں میں دیکھے ناں ایسے بہادر
موتاں، قضاواں کے لنگ جاویں باذر

سوراں تے گیدڑ، سہواں تے گوشاں
رہیاں ناں چیتل کو ویکھ کے ہوشاں

چوڑی والا کی زوردار آواز نے ایسا سماں باندھا کہ جنگ کا نقشہ کھینچ دیا۔

خیر، جب رات کافی گزر گئی اور تھکے ہاروں کو اونگھ آنے لگی تو پیر مست نے اگلے دن کا پروگرام طے کر کے دربار برخاست کر دیا۔

اگلے دن گیارہ بجے تک تمام ٹیلے چھان مارے، ایک ایک کر کے جھاڑی کریدڈالی، مگر چوہا تک نہ ملا۔ خدا جانے کہاں گم ہو گئے۔ جیسے جیسے وقت گزرنے لگا، اکتاہٹ بڑھتی گئی۔ ایک بجے کے بعد تو پیر مست نے حوصلہ چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ واپسی کرو کیونکہ شکار صحرا کو چھوڑ کر کہیں کھیتوں میں جا چھپے ہیں۔ ابھی یہ کہہ کر واپس مڑے ہی تھے کہ پاس کی بڑی جھاڑی سے ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک دم سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔ سبحان خلیفے نے ایک زور کا ڈنڈا جھاڑی پر مارا تو موٹا تازہ خرگوش فراٹے سے نکلا اور ہوا میں تیر گیا۔ فوراً چیتل اور کالے کی زنجیریں کھول دیں۔ ہلا ہو، شور شرابہ شروع ہوا، گویا صحرا جاگ اٹھا۔

لیکن دو تین ہی منٹ میں پیر مست سمیت تمام لوگ حیران رہ گئے۔ چیتل اور کالا برابر کوشش کرتے رہے، مگر خرگوش ہے کہ گھیرے میں ہی نہیں آتا، بیس بیس فٹ کے جمپ مارتا ہے۔ ابھی اس ٹیلے پر، تو دوسرے ہی لمحے اگلے ٹیلے پر۔ دس منٹ بعد تو ایسا لگا کہ خرگوش چیتل اور کالے کے ساتھ مذاق پر اترا ہوا ہے۔ دو دفعہ تو پورے مجمعے کے اوپر سے ہوا کی طرح نکل گیا۔ جب بیس منٹ گزر گئے اور خرگوش نے چیتل اور کالے کو چکرا کے رکھ دیا، تو صلاح ٹھہری کہ لوگ تین طرف بکھر جائیں، ایک سمت خالی رکھی جائے، تاکہ خرگوش سیدھا بھاگے اور کتوں کو سجی کبھی نہ دکھائے۔ خرگوش چند لمحے کسی نہ کسی جھاڑی میں رک کر سانس لے لیتا۔ جب کتے پہنچتے تو پینترا بدل کے اُلٹے ہاتھ نکل جاتا۔ مگر پیر مست کی اس ترکیب نے خرگوش کو چونکا دیا۔ اب وہ پوری طاقت سے سیدھا بھاگنے لگا۔ لیکن کتے بھی اپنی آئی پر آئے ہوئے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ فاصلہ کم ہونے لگا۔ پھر ایک دم کالے نے قیامت کا جمپ لیا۔ مگر قسمت کا کیا کیجیے کہ ہونی آئی تھی۔ خرگوش اسی لمحے رک کر زمین کے برابر ہو گیا۔ کالے نے اتنی تیزی سے قلابازی کھائی جیسے بجلی کا چھپاکا لگا ہو اور سامنے کھڑے ببول کی ایک موٹی سوکھی شاخ سے ٹکرا گیا۔ شاخ کی ایک نوک سیخ کی طرح نکلی ہوئی تھی، وہ کالے کے پیٹ میں اندر تک گھس گئی۔ کالا تو وہیں لٹک گیا، اُدھر خرگوش جھیل کی طرف بھاگ نکلا۔ چیتل، جو خود بھی قلابازیاں کھا گیا تھا، بڑی مشکل سے سنبھلا اور پیچھے ہوا۔

پیر مست اور دوسرے کئی لوگ دوڑ کر کالے کے پاس پہنچے، مگر اتنے میں وہ پورا ہو چکا تھا۔ بس ہلکے ہلکے سانس باقی تھے۔ پیر مست نے یہ دیکھا تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ وہیں غش کھا کر گر پڑا۔ مریدوں نے ہاتھ پاؤں مسلنے شروع کیے۔ کوئی پانی لینے دوڑا۔ ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بڑا مجمع پیر مست کے گرد لگ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کریں۔ پیر کو سنبھالیں یا کتے کو دیکھیں۔

اِدھر تو یہ صورت تھی، اُدھر ہوا یہ کہ خرگوش مغربی سمت میں کیچڑ سے اچھلتا ہوا جھیل میں، اور پھر وہاں سے تیر کر آگے نکل گیا۔ چیتل پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے جیسے ہی تین چار جمپ مارے، سیدھا کیچڑ اور دلدل میں پھنس گیا۔ اب نہ واپس آیا جائے، نہ آگے جایا جائے۔ ناچار، اونچی آواز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ اِدھر سے کچھ لوگ دوڑے۔ پگڑیوں سے پگڑیاں باندھیں۔ جب پگڑیوں کا لمبا رسا بن گیا تو مٹی کا ڈھیلا ساتھ باندھ کر چیتل کی طرف پھینکا۔ لیکن ڈھیلا کپڑے سمیت دور جا گرا۔ چیتل لحہ بہ لحہ نیچے دھنس رہا تھا۔ آخر تیسری کوشش پر کپڑا اس کے منہ کے قریب جا گرا۔ چیتل نے فوراً کپڑے کو جبڑے میں جکڑ لیا۔ چار آدمیوں نے زور لگایا۔ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ دلدل سے باہر کھینچا۔ باہر نکلتے ہی کتا نڈھال ہو کر گر پڑا۔

اب گاؤں میں ہر طرف سوگ کی حالت تھی۔ پیر مست رہ رہ کر کالے کو پکار رہا تھا۔ تمام مریدوں کو سانپ سونگھ گیا۔ کالے کی لاش حیات خاں کے چبوترے کے ایک طرف دفن کر کے پھول چڑھا دیے گئے۔ چیتل قبر کے پاس بیٹھا عجیب دردناک آوازیں نکالتا رہا۔ سینے چاک ہوئے جاتے تھے۔ تین چار دن تو سب پر خموشی چھائی رہی۔ آخر پانچویں دن سکوت ٹوٹا، جب پیر مست نے ٹھنڈا ہو کا بھر کر کہا: ''اچھا کالے، جدائی مقدر میں تھی۔ تو نے جانے میں بڑی جلدی کی۔ اب زندگی بے لطف ہو گئی۔'' اتنا کہہ کر چیتل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ جب پیار بھرا ہاتھ چیتل کے جسم سے لگا، وہ بے چین ہو کر پیر مست کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ پیر مست اور چیتل کے اس پیار سے لوگوں کے آنسو نکل آئے۔ آخر حوصلے بڑھے تو باتیں دوبارہ شروع ہوئیں۔

''بابا جی، میں نے تو اُسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ یہ خرگوش نہیں، اجل ہے اجل،'' شاموفوجی نے کہا۔ ''بس دن پورے ہو چکے تھے۔''

''حضور، جوڑی کیا ٹوٹی، آسمان ٹوٹا۔ ایسا صدمہ یا تو اُجاڑے کے وقت پہنچا تھا یا اب پہنچا، کالے کی جدائی کا!'' صدا حسین نے ٹھنڈی آہ کھینچی۔

''لطیف بھائی، مجھے تو ایک ہی دکھ ہے کہ اس سارے نقصان کے باوجود خرگوش سالم نکل گیا،'' خلیفہ بولا۔

''سالم نہیں نکلے گا!'' پیر مست ایک دم گرجا۔ ''چاہے وہ کوئی چڑیل اور بھوت ہی کیوں نہ تھا، چیتل اُسے پھاڑ کے دم لے گا۔''

پیر مست کی آواز میں اتنی کڑک اور لہجہ ایسا دوٹوک تھا کہ مریدین کا پورا حلقہ ایک ہی بار سہم گیا اور مکمل خموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد پیر مست پھر بلند آواز میں کہنے لگا: ''کالا میرا لکڑا تھا۔ جب تک حرامی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ہوتے نہ دیکھوں گا، واپس نہیں جاؤں گا، یہاں تک کہ میری قبر بھی کالے کے ساتھ بن جائے۔ تخم پلید میرے کالے کو کھا گیا۔ چیتل کو اکیلا کر دیا۔ حیات خاں! فوراً بندے بھیج کر ٹیلوں کی ناکہ بندی کرواور جھیل کے مغرب میں اپنے کتے پھیلا دو۔ حق غوث نے چاہا تو کل یا ہم نہیں یا خرگوش نہیں۔'' اتنا کہہ کر پیر مست نے چیتل کو تھپکی دی۔ ''چیتل! کالے کا بدلہ لیے بغیر نہیں ٹلنا۔ یہ ہمارا اُس سے عہد ہے۔'' پیر مست کی آواز میں تحکم برقرار تھا۔

چیتل پیر مست کی تائید میں دم ہلانے لگا۔

پیر مست کے اس حتمی فیصلے اور جلالت پر شہاب خلیفہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر پیر مست سے کہا: ''ویسے تو سرکار آپ کی مرضی، لیکن میں تو کہتا ہوں، واپس چلتے ہیں۔ آثار اچھے نہیں لگتے۔ لگتا ہے ستارے گردش میں ہیں۔ سینکڑوں شکار کھیلے، ایسی ہونی کبھی نہ ہوئی۔''

پیر مست نے کڑک کر کہا: ''کیا بکتا ہے! تیرے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟ خدا کے بندے عہد سے نہیں پھرتے۔ جب تک بدلہ نہ لوں گا، نیند حرام ہے۔''

''حضور سب ٹھیک،'' شہاب دوبارہ جرأت کر کے بولا، ''لیکن میں نے رات بُرے بُرے خواب دیکھے، کہ میں قبروں کا مجاور ہوں۔''

''شہابو! اپنی زبان بند رکھ۔ جب تک میں خرگوش کو پھاڑ نہیں دیتا، یہاں سے نہیں ٹلتا،'' پیر مست ایک دم گرجا۔

یہ سنتے ہی شہاب خلیفہ سہم کر چپ ہو گیا۔

آج چار سو کے لگ بھگ آدمی اور چیتل کے علاوہ بیس کتے مزید تھے۔ جھیل سمیت تمام ٹیلوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تلاش شروع ہو گئی۔ سہ پہر تک تین سؤر، چار گوہ، کئی ایک چھوٹے موٹے خرگوش شکار ہوئے لیکن مطلوبہ خرگوش کا کوئی اتا پتہ نہ ملا۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دن بھی اُس کی کچھ خبر نہ لگی۔ خدا جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ آہستہ آہستہ اکثر لوگوں کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کئی مرید اپنے گھروں کو چلے گئے، کیونکہ پیر مست نے اپنا اگلا سفر ملتوی کر دیا تھا۔ اس لیے کہ آج اُسے یہیں پر آٹھواں دن تھا اور مزید کئی دن تک تلاش جاری رکھنے کا عہد کیے ہوئے تھا۔ نویں دن شام کا دھندلکا ہو چکا تھا اور جھیل کے پار باجرے کے کھیت میں تلاش جاری تھی کہ اچانک ایک بڑا خرگوش پھر ظاہر ہوا۔ اب خدا جانے یہ وہی خرگوش تھا یا کوئی اور، مگر سب نے یک زبان ہو کر ''المدد غوث حق ہُو'' کا نعرہ مارا۔ چیتل کی زنجیر کھل گئی، مرا ہوا جذبہ ایک دم بیدار ہو گیا۔ پیر مست ہر لمحے پہلے سے بلند نعرہ مارتا۔ خرگوش نے جب اپنی جان پر بنتے دیکھی تو ایسی طاقت سے دوڑا کہ بھوت نے بھی ایسی تیزیاں نہ دیکھی ہوں گی۔ کوئی اُچھلتا ہوا بڈا دا تھا، کہ پل میں یہاں تو پل میں اُفق کنارے۔ ان کرتبوں سے ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ یہ خرگوش وہی ہے جس نے پیر مست کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ دوسری طرف چیتل کی پھرتیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں۔ خرگوش مغرب کی طرف بھاگ رہا تھا اور چیتل جگر توڑ دینے والے حوصلے سے اُس پر چڑھتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اپنے دشمن کو پھاڑ کر دم لے گا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا ٹیلا سمٹتا چلا گیا، جھیل کا چکر کاٹ کر سبز کھیتوں میں داخل ہو گئے۔ ہر گزرتے لمحے میں فاصلہ کم ہوتا گیا اور قریب تھا کہ چیتل خرگوش کو دبوچ لے، لیکن اچانک ہی ایک مایوس کن صورت اُس وقت پیدا ہوئی جب خرگوش گنے کے لمبے چوڑے کھیت میں گھس گیا۔ مگر چیتل نے بھی ہار نہ مانی، پیچھے ہی چھلانگ لگا دی۔ مریدین نے، جو اب تعداد میں پندرہ سولہ ہی رہ گئے تھے، کھیت کو فوراً گھیرے میں لے لیا۔ تھوڑی دیر تک کھیت کے اندر کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں آتی رہیں مگر اُس کے بعد خموشی چھا گئی۔ پیر مست سمیت سب لوگ بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ دس منٹ گزر گئے، پندرہ ہوئے، دھندلکا اندھیرے میں بدلنے لگا، مگر اندر سے کوئی ہلچل ہوتی نظر نہ آئی۔ پیر مست کا اضطراب بڑھ گیا۔ وہ بے چینی سے تڑپنے لگا اور اپنے چیتل کے لیے بہت فکر مند ہوا۔ پانچ چھ مرید زبردستی کھیت میں داخل کیے، لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ نامراد باہر نکل آئے کیونکہ ایک تو اندھیرا تھا اور دوسری بات یہ کہ چیتل کی گمشدگی نے ایک خوف پیدا کر دیا تھا۔ آخر گاؤں میں آدمی دوڑایا گیا۔ سینکڑوں لوگ پھر اکٹھے ہو گئے، مگر کوئی بھی گنے کے کھیت میں گھسنے کو تیار نہ تھا۔ سب پر خوف طاری ہو چکا تھا۔ اُدھر چیتل ہے کہ اس کی خبر ملنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ جوں جوں رات گزرتی گئی، پیر مست کی حالت غیر ہوتی گئی۔

دن چڑھا تو کئی لوگ ہمت کر کے کھیت میں داخل ہوئے۔ دوپہر تک تمام کھیت چھان مارا، لیکن چیتل کی کوئی خبر نہ ملی۔ یوں دوسرا دن بھی ناکام گیا۔ تیسرے دن کھیت کاٹنے کا فیصلہ ہوا، لہٰذا سب نے ٹوکے اور درانتیاں لے کر کھیت پر ہلہ بول دیا۔ ابھی آدھا کھیت کاٹا تھا کہ زمین میں ایک بڑا سوراخ نظر آیا۔ تھوڑا سا جھک کر دیکھا تو ایک دیو قامت اژدہا دور تک لیٹا ہوا پھنکار رہا تھا۔ سب ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس لیے کہ ایسی بلا تو قصہ کہانیوں میں ہی سنتے آئے تھے، دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ اژدہے نے غالباً پہلے دن کے شکار میں ہی ٹیلے چھوڑ دیے تھے۔ اُس نے خطرے کی دھمک محسوس کر کے گنے کے کھیت میں پناہ لے رکھی تھی۔ حیات خاں نے فوراً اُس پر دونالی سے ایل جی کے دو کارتوس داغ دیے جنھوں نے لمحے میں اژدہے کا کام تمام کر دیا، اور پھر ٹوچین لگا کر اسے باہر کھینچ لیا۔ پیر مست نے آگے بڑھ کر دیکھا تو چکرا کر گر پڑا۔ دراصل اژدہے نے چیتل کو نگل لیا تھا۔

پیر مست کے گرتے ہی مریدوں میں چیخ چنگاڑا شروع ہو گیا۔ کچھ تو پیر کی محبت میں زمین پر لوٹنیاں لینے لگے اور اپنے سر میں خاک ڈالنا شروع کر دی۔ دو چار نے حواس بحال رکھتے ہوئے پیر مست کو جلدی سے گاؤں کے ہسپتال میں پہنچایا، لیکن سب بے کار تھا۔ ڈاکٹر نے کہا، ''بابا جی کو دل کا زبردست اٹیک ہوا ہے۔''

اگلے دن صبح تک یہ بحث جاری رہی کہ آیا چیتل کی کوئی نشانی، پنجہ، کان یا کوئی ناخن وغیرہ ہے، جسے پیر مست اور کالے کے ساتھ دفن کر دیا جائے، لیکن کوشش کے باوجود چیتل کی کوئی چیز نہ ملی۔ بالآخر شامو نے کہا، ''کیوں نہ اژدہے کی قبر بھی پیر مست اور کالے کے ساتھ بنا دی جائے۔ آخر کو چیتل اژدر کے اندر ہی تو ہے۔''

اب خلیفہ شہاب دین صبح اُٹھ کر روزانہ تینوں قبروں پر جھاڑو دیتا ہے مگر اُس کے دل سے ایک کسک نہیں جاتی کہ آیا تیسری قبر اژدر کی ہے یا چیتل کی؟

جودھ پور کی حد

''مردوں پر اونچ نیچ تو آتی ہے، مگر ایسا قہر پہلے کبھی نہیں پڑا۔ الیاسے! جینے کے قابل نہیں رہے۔''

''ابا، اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ داغ تو دُھل نہیں سکتا، چاہے لاکھ صفائیاں دیتے پھریں۔ اب تو کچھ ایسا کرو کہ کسی طرح لوگوں کے منھ بند ہو جائیں،'' الیاسے نے منھ اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''بے غیرتا آپ مر گیا اور یہ سوغات چھوڑ گیا ہمارے لیے، تاکہ ساری زندگی سر اُٹھا کے نہ چل سکیں،'' حاجی دوبارہ بولا۔ پھر شریف کی طرف منھ کر کے جو ابھی تک چپ بیٹھا تھا: ''شریفے، اب تو ہی کوئی حل بتا۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

کچھ دیر ٹھہر کر شریف بولا، ''حاجی، میں نے بڑا غور کیا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو اب اس کا ایک ہی حل ہے۔'' پھر منھ آگے کر کے آہستہ سے حاجی شریف نے لطف اللہ اور الیاسے کو اپنی تجویز پیش کی، جسے سن کر الیاس تو فوراً متفق ہو گیا مگر اس کا باپ لطف اللہ تذبذب میں پڑ گیا۔ لیکن بالآخر اس نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

جب غفورے کی ماں کو طلاق ہوئی تو وہ تین سال کا تھا، لہٰذا جودھ پور گاؤں آتے وقت ماں اسے بھی ساتھ لے آئی۔ یہاں غفورے کا نانا اس کے ناز اٹھانے لگا۔ جب بھی مسجد میں نماز پڑھنے جاتا، واپسی پر شیرینی یا پھل ضرور لے کر آتا۔ کھلونوں اور کپڑوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ماں الگ پیار دیتی۔ غرض بچپن ناز و نعمت میں گزرنے لگا۔ پانچ برس کا ہوا تو گاؤں کے سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ مگر قسمت سے غفورے کو ذہن ایسا ملا جو علم کا بوجھ سہارنے سے یکسر عاجز تھا۔ ایک سال سکول جاتے ہو گیا، مجال ہے ایک لفظ حافظے میں داخل ہوا ہو۔ ایک دن استاد نے غفورے کے آگے ہاتھ باندھے کہ حضور، ہم میں اتنی سکت نہیں کہ آپ کے دماغ کا ساتھ دے سکیں جو علم کے لیے بنا ہی نہیں۔ لیکن غفورے کی ماں اسے ہر حالت میں پڑھانے پر مصر تھی، اور شاید مصر رہتی کہ اچانک غفور محمد کا نانا فوت ہو گیا۔ چالیسواں ہوئے ابھی پانچ دن ہی ہوئے تھے کہ لطف اللہ نے غفورے اور اس کی ماں کو ایک الگ جگہ رہنے کو مختص کر دی۔ اب گھر کے چھوٹے موٹے کام یہی کرنے لگا۔ مگر سیدھا کام مشکل ہی سے اس کے ہاتھ سے انجام پاتا۔ تسلیم کی خُو ایسی کہ گھر کا نوکر بھی کوئی کام کہتا تو بھاگ اٹھتا۔ ظاہر ہے کند دماغ تھا اس لیے کام میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو جاتی، لہٰذا پھٹکاریں بھی سننی پڑتیں۔ غفورے کی ماں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی مگر بیچاری کر کچھ نہیں سکتی تھی کیونکہ باپ مرنے کے بعد بھائی کے دروازے پر اسی طرح گزارا ہوتا ہے۔ دو تین ماہ یونہی گزرے، آخر سکول چھوڑ دیا کہ یہ اس کے بس کا نہیں تھا۔ اب ہر کوئی غفورے ہی کو کام کہنے لگا: غفورے، بھاگ کے جاؤ سبزی لا دو؛ غفورے، دوڑو، چکی سے آٹا پسوا لاؤ؛ کوئی کہتا، غفورے بوندھو، لینا ذرا میرے سر سے جوئیں نکالنا، اور کوئی اس سے ٹانگیں دبواتا۔ ماں اسے سب کچھ کرتے دیکھتی مگر بے بس رہتی۔ بعض دفعہ اس نے اسے کام کرنے سے روکا بھی، مگر یہ شاید ایسے کام کرنے میں خوش تھا کہ سکول سے جان بچی ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ معاملہ چھوٹے چھوٹے کاموں سے بڑھ کر بڑے کاموں تک جا پہنچا۔ لطف اللہ نے زمینداری کی دیکھ بھال اور مویشیوں کا بوجھ بھی اسی کے سر پر ڈال دیا۔ گویا بے دام کا نوکر تھا کہ لطف اللہ کے ہاتھ آ گیا۔ یوں تو لطف اللہ کا ایک بیٹا محمد الیاس بھی تھا، مگر وہ بھی اپنے حصے کا کام غفورے ہی سے لیتا اور رُعب الگ ڈالتا۔ بعض اوقات بڑی بے رحمی سے مارتا بھی۔ پندرہ سال کا ہوا تھا کہ ماں فوت ہو گئی، جس کی وجہ سے پندرہ بیس دن تو لوگ شفقت سے پیش آئے پھر اُس کے بعد کھل کھیلنے لگے۔ اب غفورے بوندھو کے دو ہی کام رہ گئے تھے کہ ہر کسی کا حکم ماننا اور روٹی کھا کر بھینسوں کے باڑے میں ہی سو جانا۔ نوکر چاکر بھی اپنا کام اسی سے لینے لگے۔ اس قدر تسلیم کی عادت نے اسے بزدل بھی بنا دیا۔ اپنی رائے اور سوچ تو شروع دن سے ہی نہ تھی، یہاں تک کہ روٹی بھی تب کھاتا جب کوئی اُسے کہتا؛ بعض دفعہ تو فاقے سے ہی سو گیا۔ بھینسوں کا دودھ دوہ کر گھر پہنچاتا، مجال ہے ایک قطرہ بھی کبھی پیا ہو۔ غرض انھی صفات اور بزدلی کی وجہ سے غفورے کا نام غفورا بوندھو پڑ گیا۔ اپنے ماموں زاد الیاس سے تو ایسے ڈرتا جیسے وہ موت کا فرشتہ ہو۔ اگرچہ یہ دونوں ہم عمر تھے مگر اس کا ہر حکم بے چون و چرا تسلیم کرتا۔ انھی حالات میں پچیس سال کا ہو گیا۔

کریماں گھر سے باہر نکلتی تو گاؤں میں ایک طوفان آ جاتا۔ کم بخت نے ناک نقشہ ایسا نکالا کہ قیامت کر دی۔ سفید کلیوں کے گجرے بالوں میں ٹانکے رکھتی، کلائیاں چوڑیوں سے بھری رہتیں اور ناک کی نتھلی تو گویا چاند کے جیسی بڑی تھی۔ تھی تو ابھی کنواری لیکن طور سارے کے سارے سہاگنوں کے۔ ابھی دس سال کی ہو گی کہ باپ آسمانی بجلی گرنے سے جل مرا، لہٰذا بھتیجی کی پرورش بھی لطف اللہ کے ذمے آ پڑی۔ باپ چونکہ پچاس ایکڑ چھوڑ کر مرا تھا اس لیے نخرے سر چڑھ کر بولتے۔ لطف اللہ اور الیاس تو ایک طرف، اس نے کبھی ماں کی بھی نہ سنی۔ کبھی کسی سہیلی کے ہاں جا نکلتی اور کبھی زمینوں پر ساگ لینے۔ یہ کام تو گویا بہانے تھے، اصل میں اپنے حسن کی تشہیر تھی۔ الیاسے نے پکڑ کر کئی دفعہ پیٹا بلکہ ایک دن تو مار مار کے ادھ موا کر دیا اور سر بھی پھوڑ ڈالا مگر اُدھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ برملا کہتی، میں کسی سے دبنے والی نہیں، جو جی میں آیا کروں گی۔

آخر ایک دن لطف اللہ نے حاجی شریف سے صلاح کر کے کریماں کو غفورے بوندھو سے گانٹھ دیا۔ بیچاری بہت چیخی چلائی کہ میں ہرگز بوندھو سے نکاح نہ کروں گی۔ کریماں کی ماں نے الگ شور مچایا کہ یہ ظلم کیوں کرتے ہو، میری بیٹی کو احمق اور بدھو سے کیوں باندھ رہے ہو۔ لیکن آخر فیصلہ وہی ہوا جو لطف اللہ اور حاجی شریف نے کر دیا۔ اور بالکل اُسی دن الیاس کا نکاح حاجی شریف کی بیٹی ثمینہ سے پڑھا دیا گیا۔

یوں حاجی شریف اور لطف اللہ اور زیادہ قریب ہو گئے، ہم زلف تو پہلے ہی تھے۔

یوں تو کریماں کا اپنے باپ کی زمینوں پر حق تھا لیکن تھا وہ صرف کاغذات کی حد تک؛ ان پر اصل کنٹرول الیاس اور لطف اللہ ہی کا تھا۔ غفورا بوندھو بظاہر تو اب ان کا داماد تھا، مگر حقیقت میں وہ اب بھی نوکر کی حیثیت رکھتا۔ کریماں نے غفورے کے نکاح میں آنے کے بعد اوّل اوّل تو بہت سرکشی دکھائی اور غفورے کو گالی گلوچ بھی کرتی حتیٰ کہ چمٹے اور ڈوئی وغیرہ سے مرمت بھی کی، پھر رفتہ رفتہ اعتدال پر آ گئی اور اسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ نوکر نہیں بلکہ اس گھر کا مالک ہے۔ مگر وہ رہا بوندھو کا بوندھو۔ اتنا بڑا ہونے کو ہوا پھر بھی الیاس سے بغیر مزاحمت مار کھاتا۔

کریماں لاکھ چلاتی کہ اپنا الگ کام کرو لیکن یہ اُن کے گھر کا نوکر۔ نکاح ہوئے دو سال ہو گئے مگر بوندھو نے ابھی تک بھینسوں کا باڑا نہ چھوڑا۔ ہاتھ پاؤں ہر وقت گوبر میں لتھڑے رہتے۔ کریماں ہفتے عشرے بعد زبردستی نہلا دیتی۔ جتنی وہ نفیس اور آرائش پسند تھی اتنا ہی یہ بدلباس اور غلیظ تھا۔ کریماں جب بھی الیاسے کو دیکھتی کہ وہ غفورے پر حکم چلا رہا ہے تو جل کے راکھ ہو جاتی اور سوچتی کہ خدا جانے کم بختوں نے کون سے تعویذ پلائے ہیں، اتنا ہٹا کٹا ہو گیا لیکن بیلوں کی طرح حکم مانتا ہے۔ اسی طرح تین سال ہو گئے۔ الیاسے کے ہاں دو بچے ہو گئے۔ ثمینہ چھاتی تان کر کریماں کے پاس سے گزرتی اور بات بات میں کچوکے لگاتی۔ اِدھر یہ خالی گودی اندر ہی اندر جلتی رہتی اور غفورے کو کوستی، مگر وہ برف کی طرح ٹھنڈا، جیسے کوئی روبوٹ کام کے لیے بنایا گیا ہو۔ کریماں کے پاس آنے سے بھی ڈرتا کہ کوئی کرنٹ نہ لگ جائے۔ بیچاری گاؤں کی عورتوں کے طعنے الگ سنتی۔

پھر ایک رات وہی ہوا جسے آخر ہونا تھا۔ کریماں شاکے کے ساتھ بھاگ گئی جو اسی گھر کا نوکر تھا، اور چودھریوں کی ناک کٹ گئی۔ گاؤں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ حاجی لطف اللہ جو ابھی دو ماہ پہلے ہی حج کر کے آیا تھا۔ مسجد میں جانے سے ڈرنے لگا۔ الیاسے کے پاؤں کے نیچے تو گویا انگارے آ گئے۔ وہ کبھی غفورے کو پیٹتا اور کبھی کریماں کی ماں کو کوستا کہ اُس نے کیسی ڈائن پیدا کی جو گھر کی عزت کھا گئی۔

اب غفورے نے چپ سادھ لی۔ وہ کام تو اسی طرح ہی کرتا رہا لیکن طبیعت میں ایک بے چینی اور روکھا پن در آیا۔ اب وہ بجائے باڑے میں رہنے کے گھر چلا آتا اور دیر تک چولہے کی سرد راکھ کریدتا۔ اگر کوئی بلاتا تو بالکل جواب نہ دیتا، اُٹھ کر اندر چلا جاتا اور کریماں کے کپڑوں میں منہ چھپا کر رونے لگتا اور بار بار کریماں کے سامان اور چیزوں کو ٹٹولتا اور پھر گھر سے نکل جاتا۔ اسی حالت میں کافی دن گزر گئے۔ عادتیں باؤلے کی سی ہو گئیں۔ بلاوجہ مویشیوں کو مارنا شروع کر دیتا اور آہستہ آہستہ نہ جانے کیا بڑبڑاتا۔

ایک طرف غفورے کی یہ حالت تھی، جبکہ دوسری طرف الیاسے نے اپنے تمام وسائل شاکے اور کریماں کو ڈھونڈنے میں لگا دیے۔ اسے ایک ہی دکھ تھا کہ ایک تیلی اُن کی عزت کو کیسے لے گیا۔ آخر تین ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد دونوں کا کھوج لگ گیا۔ حویلی لکھا کے ایک گاؤں دیوا سنگھ میں جو ضلع قصور سے ڈیڑھ سو میل دور تھا، ایک چودھری کے ہاں پناہ لے رکھی تھی۔ چھاپہ مارا تو شاکا تیلی تو بھاگ گیا مگر کریماں پکڑی گئی۔ وہ اُسے گھر لے آئے۔ ماں نے کوسا، الیاسے نے مار مار کے بازو توڑ دیا۔ حاجی لطف اللہ اور حاجی شریف نے الگ سر پر عصاؤں کے وار کیے۔ رات کو کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا، جس کی چابی الیاسے نے اپنے پاس رکھ لی اور کریماں کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے لگے کہ اب اس کا کیا کیا جائے۔ پورے گاؤں میں سناٹے کا سا عالم تھا، کسی شخص کی جرأت نہیں تھی کہ کوئی بات کرے۔ الیاسے کا رعب اور دبدبہ نہ صرف سارے گھر پر تھا بلکہ گاؤں کا ہر فرد اُس سے ڈرتا۔ ہر کسی کو پتہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اب جبکہ فیصلہ کرنے بیٹھے تو بھی حاجی شریف، حاجی لطف اللہ اور الیاس کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ کسی کو اجازت تھی کہ انھیں کوئی مشورہ دے۔ کریماں کی ماں نے دو تین دفعہ اندر آنے کی کوشش کی مگر الیاس کی نظروں سے خوف کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔

رات ایک بجے الیاس نے غفورے بوندھو کو بلایا اور کریماں کو کمرے سے باہر لا کر چل دیے۔ حاجی شریف بھی ساتھ تھا۔ کریماں کی ماں دوہتڑ پیٹنے لگی کہ میری بیٹی کو نہ مارو، تمھیں خدا کا واسطہ ہے، اور اسے الیاس کے ہاتھ سے چھیننے لگی۔ اسی چھینا جھپٹی میں اس نے الیاس کے بازو پر کاٹ بھی لیا۔ الیاس نے دو تین تھپڑ اپنی تائی کریماں کی ماں کے بھی جڑ دیے۔ بیچاری منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔ جب کریماں کی ماں نے شور بلند کیا تو الیاس نے اسے پکڑ کر اُسی کمرے میں بند کر دیا جہاں کریماں کو بند کیا تھا، اور کریماں کو لے کر باہر ویرانے میں آ گئے۔ ایک کلہاڑی اور ایک کسّی ساتھ تھی۔ الیاس نے کریماں کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف لٹا دیا اور غفورے کو ساتھ لے کر گڑھا کھودنے لگا۔ حاجی شریف بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب گڑھا چھ فٹ تک گہرا کھد گیا تو الیاسے نے پکڑ کر کریماں کو اندر پھینک دیا اور غفورے کو حکم دیا کہ کسّی سے اوپر مٹی پھینکے۔ حاجی شریف بھی ہاتھوں سے مٹی پھینکنے لگا۔ کریماں کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا مگر وہ بار بار کبھی الیاسے اور کبھی حاجی شریف کو رحم طلب نظروں سے دیکھتی رہی، جس کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا، بلکہ حاجی شریف نے اور تیزی سے مٹی پھینکنا شروع کر دی۔ غفورا ابھی آہستہ آہستہ مٹی ڈالنے لگا لیکن الیاسے نے غفورے کے ہاتھ سے کسّی پکڑ کر جلدی جلدی مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ کریماں کا چہرہ مٹی میں چھپنے لگا تو اُس نے آخری رحم طلب نظروں سے غفورے بوندھو کی طرف دیکھا۔ اُسی لمحے غفورے کا ہاتھ کلہاڑی پر جا پڑا اور پھر ایک دم الیاسے کے سر پر لوہے کا پہاڑ گر پڑا۔ اُس کے بعد حاجی شریف دو قدم بھی بھاگ نہ سکا۔ پھر بوندھو اور کریماں نے مل کر الیاسے اور حاجی شریف کو گڑھے میں دفن کر دیا اور رات چار بجے سے پہلے جودھ پور گاؤں کی حد پار کر گئے۔

کمّی بھائی

حاجی عبدالکریم کے مرنے کی خبر سن کر عورتیں گھروں سے یوں نکلیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ بازار میں گویا لوگوں کی ایک نہر تھی کہ حاجی صاحب کے گھر کی طرف رواں تھی۔ بعض عورتیں تو بین کرتی جاتیں۔ میں اُس وقت کوئی سات برس کا ہوں گا۔ نہیں کہہ سکتا کہ حاجی صاحب سے میری شناسائی تھی، ہاں مگر صبح سویرے دادی اماں مجھے اٹھاتی کہ چلو مولوی جی سے قرأت پڑھ کر آؤ، تو اس وقت مسجد میں میرا سامنا پہلے حاجی عبدالکریم سے ہی ہوتا۔ وہ عین پیش امام کے پیچھے کھڑے ہوتے۔ کئی دفعہ یہ بھی ہوا کہ حاجی صاحب وقت پر نہیں پہنچے تو پیش امام نے انتظار کھینچا اور جماعت میں تاخیر کی۔ بہر حال، میرا اُن سے یہی تعارف تھا۔ اس کے علاوہ نہ انھوں نے کبھی مجھے پوچھا نہ میں نزدیک ہوا۔

اب اُن کے مرنے پر نہ تو مجھے غم تھا نہ خوشی۔ البتہ قدم غیر ارادی طور پر بڑی حویلی کی طرف اُٹھ گئے اور اب حویلی کے سامنے لوگوں کے ٹھٹھ میں کھڑا تھا۔ بین اُٹھ رہے تھے۔

اردگرد کے گاؤں میں آدمی دوڑا کر اعلان کروا دیے گئے تا کہ سلام دُعا والے کندھا دے سکیں۔ ہمارا گاؤں، یا یوں کہیں کہ حاجی صاحب کا گاؤں، کافی بڑا تھا جس کی آبادی پانچ ہزار ہوگی۔ بازار کھلے کھلے اور اونچے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ گاؤں میں چار بڑی برادریاں تھیں، لیکن چودھراہٹ حاجی صاحب کی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی سو گھر کمیوں کا ہوگا۔ حاجی صاحب نے دس حج کیے، نماز روزے کی پابندی ہمیشہ کی۔ بھرواں جسم، لمبا قد اور لمبی سفید داڑھی تھی۔ میں نے ہمیشہ انھیں سفید ململ میں ہی دیکھا۔ ہاتھ میں عصا رکھتے۔ گاؤں میں سب سے زیادہ زمین بھی انھیں کی تھی، لہٰذا پنچایت میں مرکزی حیثیت بھی اُن کی ہوتی اور جو منہ سے نکل جاتا پتھر پر لکیر ہوتا؛ کسی کی کیا مجال کہ ان کے آگے دم مارے۔

میں لوگوں کا ہجوم چیرتا ہوا اُس کی چارپائی تک جا پہنچا جہاں عورتوں کے رونے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ رونے والیوں میں اکثر عورتیں کمیوں کی تھیں۔ ایک دو منٹ حاجی صاحب کا منہ دیکھتا رہا جن کی ٹھوڑی کے نیچے سے سفید کپڑا باندھ دیا گیا تھا۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل زرد ہو چکا تھا۔ جبڑے اندر کو دھنسے ہوئے اور منہ کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں جنھیں دیکھ کر مجھے خوف آنے لگا اور میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ شاید پہلی بار کسی مُردے کو دیکھا تھا اس لیے ڈر گیا۔ باہر آ کر کھلی فضا میں کھڑا ہو گیا اور اُس وقت حیران رہ گیا جب عورتیں یہ کہتے ہوئے گزریں: ''بھیناں، حاجی صاحب پر آج کوئی روپ آیا۔ اللہ بخشے کتنے نیک تھے۔'' میں جلد ہی اپنے گھر چلا آیا اور شانی کے ساتھ گولیاں کھیلنی شروع کر دیں۔ مغرب سے پہلے جنازہ اٹھ گیا۔ لوگ جنازہ گاہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے لیکن مجھے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ رات البتہ سوتے میں ڈرتا ضرور رہا۔

دوسرے دن سویرے مسجد گیا تو مولوی جی نے ہم تمام بچوں سے مخاطب ہو کر کہا، ''بیٹا، تمھیں پتہ ہے کل حاجی عبدالکریم فوت ہو گئے۔ اللہ بخشے گاؤں کے لیے رحمت تھے۔ آج گاؤں یتیم ہو گیا۔ کیا مجال تھی حاجی صاحب کے ہوتے کوئی گاؤں پر بُری نظر ڈالتا۔ میرے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک تھا۔''

اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب کے آنسو نکل آئے۔

تھوڑی دیر رُک کر بولے:

''پُتر، آج اپنے اپنے سپارے لے کر حاجی صاحب کی قبر پر چلو اور تلاوت کر کے اُس کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہاں شیرینی بھی ہوگی۔''

شیرینی کے لالچ میں ہم سب حاجی صاحب کی قبر پر آ گئے۔ قبرستان گاؤں کے مشرقی کونے پر پانچ ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور گاؤں کے ساتھ جُڑا تھا۔ دوسری طرف نہر بہتی تھی لیکن نہر کا کوئی اثر قبرستان پر نہیں تھا۔ چاروں طرف مٹی گارے کی دیواریں تھیں۔ قبرستان کے اندر گنی چنی قبریں تھیں۔ کوئی سایہ دار درخت نہ تھا۔ البتہ جھاڑیاں بکثرت اُگی ہوئی تھیں جن میں سانپ اور کیڑے مکوڑے رینگتے پھرتے۔ جگہ جگہ چوہوں نے کھڈیں بنا رکھی تھیں جس کی وجہ سے اکثر قبریں زمین میں دھنس گئی تھیں۔ آوارہ گدھے اور کتے دن رات پھرتے رہتے۔ بوسیدہ ہڈیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا کہ چڑیلوں کا یہی ٹھکانہ ہے۔

جب ہم قبرستان پہنچے تو حاجی عبدالکریم کا بڑا بیٹا حاجی سیف الرحمٰن اور چند دوسرے لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ہم سب بڑے ادب سے قبر کے گرد بیٹھ گئے اور تلاوت شروع کر دی۔ قبر، قبرستان کے درمیان میں تھی۔ تلاوت کے بعد مولوی جی نے ختم پڑھا اور شیرینی تقسیم کی گئی۔ ہماری اس مصروفیت کے دوران دینے گورکن نے ایک جامن کا پودا قبر کے بالیں کی طرف لگا کر اُسے پانی دے دیا، جس پر سیف الرحمٰن نے خوش ہو کر دینے کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ نوٹ لے کر دینا سیف الرحمٰن کو دعائیں دینے لگا۔ رخصت کے وقت مولوی جی نے حاجی سیف الرحمٰن کے گلے مل کر اسے دلاسا بھی دیا۔ پھر ہم چل دیے۔ دو چار ہی قدم چل کر مولوی جی اچانک رک گئے اور سیف الرحمٰن کی طرف منہ کر کے کہنے لگے:

''بیٹا سیف الرحمٰن! ایسا کر حاجی صاحب کی قبر کے گرد چھوٹی سی دیوار بنا دے اور قبر بھی پکی کر دے تا کہ بارش اور کتے بلے نقصان نہ پہنچائیں۔'' سیف الرحمٰن نے مولوی کی بات سن کر سر ہلا دیا۔ دینا گورکن بھی غور سے سن رہا تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے گھروں کو چلے آئے اور کھیل دھندوں میں لگ گئے۔ تیسرے دن مسجد میں قُل ہوئے اور ساتویں کو ساتہ، جس میں پھل اور مٹھائیاں خوب تقسیم ہوئیں اور ہماری موجیں ہوئیں۔ میں نے دل میں سوچا، کاش روز کوئی اسی طرح مرتا رہے۔

اس کے بعد ایک ماہ تک مکمل سکوت رہا۔ ایسے لگا جیسے مولوی جی خود بھی حاجی صاحب کو بھول گئے ہوں۔ لیکن ایک دن اچانک صبح مولوی صاحب نے ہمیں فرمایا، ''بیٹا، آج پھر حاجی صاحب کی قبر پر

قرآن خوانی کرنی ہے کیونکہ آج حاجی صاحب کا چالیسواں ہے۔'' پچھلی بار کی شیرینی ہمیں یاد تھی لہٰذا ہم خوشی خوشی چل دیے۔ لیکن اس بار حاجی صاحب کا بیٹا وہاں موجود نہ تھا اور نہ ہمیں وہاں کہیں مٹھائی دکھائی دی۔ ہم سب بددل ہو گئے اور دل ہی دل میں مولوی کو کوسنے لگے۔ فقط دینا گورکن کھڑا تھا۔ اس نے قبر پر تازہ چھڑکاؤ بھی کیا اور گلاب کی پتیاں بکھیر کر اگربتیاں سلگا رکھی تھیں جن کا خوشبودار دھواں ہمیں اچھا لگ رہا تھا۔ سب سے الگ چیز جو نظر آئی وہ یہ کہ قبر کے گرد کافی کھلا صحن چھوڑ کے چھوٹی کچی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ جامن کا پودا بھی ہرا بھرا لہلہا رہا تھا۔

گورکن نے آگے بڑھ کر مولوی کو سلام کیا جس کا مولوی صاحب نے بے نیازی سے جواب دیا۔ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد گورکن بڑے فخر سے بولا، ''مولوی صاحب! پچھلی دفعہ آپ نے جو مشورہ دیا اُسے حاجی سیف الرحمٰن نے میرے ذمے لگا دیا تھا، کیونکہ اُن کو تو اور بھی سو کام ہوتے ہیں، اور پھر حاجی صاحب کون سے بیگانے تھے۔ مجھے بھی اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ کچی اینٹیں پڑی تھیں، میں نے سوچا قبر تو پکی میں بنا نہیں سکتا۔ چلو اس کے گرد کچی دیوار ہی کر دوں۔ حاجی صاحب نیک آدمی ہیں، مجھے بھی ثواب ہوگا۔'' پھر آہستہ سے مولوی جی کے نزدیک ہو کر بولا، ''مولوی صاحب، یہ صحن میں نے اس لیے کھلا رکھ دیا ہے کہ حاجی کی بیوی بیچاری بوڑھی ہو گئی ہے۔ اللہ نہ کرے، اونچ نیچ ہو جاتی ہے، اس کی قبر بھی حاجی صاحب کے ساتھ بن جائے گی۔ حاجی حاجن پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔''

مولوی نے یہ سُن کر گورکن کو تھپکی دی اور حاجی صاحب کی قبر کے متعلق دو تین مشورے مزید دیے۔ اس کے بعد ہمیں قرآن خوانی کا حکم دیا۔ ابھی قرآن خوانی کر ہی رہے تھے کہ حاجی سیف الرحمٰن اپنے نوکر کے ساتھ شیرینی لے کر آ پہنچا جسے دیکھ کر ہمارے چہروں پر ایک رونق سی آ گئی اور ہم نے زور شور سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ جتنی دیر ہم قرآن خوانی کرتے رہے، حاجی سیف الرحمٰن مولوی جی اور گورکن آپس میں باتیں کرتے رہے جو قرآن پڑھنے کے شور کی وجہ سے ہمیں سنائی نہ دیں۔

جب رخصت ہونے لگے تو میں نے دیکھا حاجی سیف الرحمٰن نے مولوی جی اور گورکن کو ایک ایک سو روپیہ دیا۔ پھر ہم سب واپس چلے آئے اور حاجی عبدالکریم، جس سے میری پہلے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، میرے لیے ایک خواب ہو گیا۔ اب گاؤں میں شاید ہی کوئی ہوگا جس نے کبھی حاجی صاحب کا ذکر کیا ہو۔ حتیٰ کہ ایک سال گزر گیا۔ پھر مزید کچھ ماہ بعد میں نے مولوی جی سے قرأت پڑھنا بھی چھوڑ دیا اور مکمل طور پر اپنے کھیل اور سکول کی طرف متوجہ ہو گیا۔

گاؤں کے بوڑھے مرتے رہے لیکن پھر نہ تو میں نے کسی کا جنازہ پڑھا اور نہ قبرستان کی راہ دیکھی۔ البتہ ایک دفعہ عید کی نماز پر جب مولوی صاحب نے گاؤں والوں کو قبرستان کی خستہ حالی پر شرم دلائی تو انھوں نے پکی چاردیواری کرنے کا ارادہ کیا جس میں تمام گاؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور چاردیواری کھڑی کر دی۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تک کہ میں میٹرک میں جا پہنچا اور عمر کے پندرھویں سال میں۔ پھر ایک دن اچانک چودھری خوشی محمد کے مرنے کا اعلان ہوا۔ میں زیادہ غور نہ کرتا لیکن چونکہ چودھری کا چھوٹا بیٹا امجد میرا کلاس فیلو تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا۔ کندھا دیا، جنازہ پڑھا، حتیٰ کہ دفنانے تک شریک ہوا۔ اور قبرستان میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آٹھ سال بعد نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ حاجی صاحب کی قبر پر ایک بڑے جامن کے درخت کے علاوہ اور بہت سے درخت قبرستان میں اُگے ہوئے ہیں۔ اکثر قبریں پکی ہو چکی ہیں اور بہت سوں کے گرد کھلی چاردیواریاں، جن کے احاطے پانچ پانچ مرلے تک کھلے تھے اور قبروں پر نام نسب کے کتبے الگ۔ حاجی عبدالکریم کی قبر پر تو ایک گنبد بھی بن چکا تھا جس کے نیچے اب حاجی کی بیوی بھی دفن ہو چکی تھی جو دو سال پہلے فوت ہوئی۔ یہ گنبد غالباً اُسی وقت بنایا گیا تھا۔ لیکن قبرستان میں ابھی بہت سی جگہ خالی تھی۔ مجھے یاد ہے چودھری خوشی محمد کی قبر کی تیاری کے وقت بھی میں امجد کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ہمارے جانے سے پہلے ہی دینے گورکن نے قبر ایک کھلی جگہ پر کھودی اور اردگرد کی قریباً پانچ مرلے جگہ جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر دی جسے دیکھ کر ہم داد دیے بغیر نہ رہ سکے، بلکہ امجد نے دینے کو دو سو روپے انعام بھی دیا۔ جس پر دینے نے چودھری خوشی محمد کی کافی تعریف کی اور کہا، ''چودھری صاحب، میں نے سوچا ہمارے چودھری خوشی محمد بڑے اچھے آدمی تھے، قبر ذرا کھلی جگہ پر بنا دوں، تاکہ فاتحہ کہنے میں آسانی رہے۔ جگہ میں نے صاف کر دی ہے۔ اب چودھری جی، کل پکی اینٹوں کی دیوار کروا دیں تاکہ یہ جگہ گھیرے میں آ جائے اور محفوظ ہو جائے۔''

میٹرک کرنے کے بعد میں شہر چلا آیا تاکہ مزید پڑھ لوں۔ گاؤں میں ہمارا ایک ہی گھر تھا جو یوپی سے مہاجر ہو کر آیا تھا اور نہ جانے کن حالات میں اس گاؤں میں آ بیٹھا۔ عزیز و اقارب لاہور اور کراچی جا بسے۔ اس لیے ہماری یہاں کوئی برادری نہیں تھی جبکہ گاؤں کی باقی آبادی مقامی تھی۔ لہٰذا اثر و رسوخ نہ ہونے کی بنا پر ہمارا شمار بھی کمیوں میں آتا۔

شہر میں، میں نے ایک میڈیکل سٹور پر رات کی نوکری کر لی جو دو بجے تک جاری رہتی۔ اڑھائی بجے سو جاتا۔ صبح نو بجے کالج نکل جاتا۔ اس طرح گاؤں میں میرے چکر ہفتے کے بجائے مہینے پر جا ٹھہرے۔ شہر میں کافی دوست بھی نکل آئے، لہٰذا گاؤں جاتا تو اگلے ہی دن واپس چلا آتا۔ یوں مدت تک قبرستان کی طرف گزر نہ ہوا اور شہر میں آئے مجھے چھ سال ہو گئے۔ اس عرصے میں محکمۂ ڈاک میں کلرکی کرنے لگا اور ماہ بہ ماہ تنخواہ لے کر گھر چلا جاتا۔ بلکہ اب کبھی کبھی تو ہفتے بعد ہی نکل جاتا کیونکہ دادی اماں کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ایک دن دفتر میں ڈاک سیل کر رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے آواز دی۔ پاس گیا تو اس نے رسیور ہاتھ میں دے دیا۔ فون سن کر چکرا گیا۔ والد صاحب نے دادی اماں کی موت کی خبر سنائی۔ دادی اماں سے میری جس قدر محبت تھی اس کا پہلا ردِعمل تو یہ ہوا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ مصیبتوں کی ماری جب سے انڈیا سے آئی، افلاس اور نکبت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دادا میاں آتے ہی چل بسے۔ ترکاریاں بیچیں۔ سوت کاتے۔ خود بھوکوں جئی اور چھ اولادوں کو پالا۔ اب جو یہ موت کا پیغام آیا تو مجھے اُس پر بڑا ترس آیا۔ خدا جانتا ہے آج تک اُس سے تہجد قضا نہ ہوئی۔ مجلس کی استطاعت نہ تھی مگر گھر میں ائمہ طاہرین کی چھوٹی موٹی نیازیں دلوانا نہ بھولی۔

میں نے سپرنٹنڈنٹ سے چھٹی لی، کام چھوڑا۔ بھاگم بھاگ اڈے پر آیا، بس پکڑی اور شام سے پہلے گاؤں جا پہنچا اور اماں کی لاش سے خوب لپٹ کر رویا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ اماں کو نہلایا گیا اور کفن دے دیا۔ عشا ہو گئی لیکن میت نہ اُٹھی پھر آٹھ بج گئے۔ نو بج گئے۔ جاڑے میں نو بھی آدھی رات جا بجتے ہیں ہمارے گھر میں رونے دھونے کے علاوہ چہ میگوئیاں بھی جاری تھیں اور ابا میاں کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پوچھا، ''ابا جی، اماں کی میت نہیں اٹھی۔ اب کس کا انتظار ہے؟''

بولے، ''انتظار تو کسی کا نہیں، بس قبر کی دیر ہے۔''

میں نے کہا، ''شام سے اب تک قبر کیوں نہ بنی؟''

بولے، ''قبرستان میں جگہ نہیں۔''

میں نے کہا، ''یہ کیا ہوا! اتنا بڑا قبرستان ہے۔ ابھی کل کی بات ہے اڑھائی قبریں تھیں۔''

بولے: ''لیکن اب جگہ نہیں رہی۔''

اتنا سننا تھا کہ میں بھاگا قبرستان آیا۔ گورکن کے گھر کا دروازہ پیٹا جو قبرستان کے اندر ایک کونے میں تھا اور اب سارے کا سارا پکا ہو چکا تھا۔

گورکن باہر نکلا تو میں نے پوچھا: ''چاچا، کیا بات ہے قبر نہیں بناتے؟ اماں باہر پڑی ہے۔''

کہنے لگا: ''بھائی، کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں، بڑھیا کا کہیں اور بندوبست کرو۔ قبرستان میں جگہ نہیں۔''

میں نے کہا: ''چل دیکھتے ہیں۔ جگہ کیسے نہیں؟''

بولا: ''تیرے باپ کا نوکر ہوں آدھی رات قبریں پھلانگتا پھروں اور سانپ ڈسوالوں۔''

میں نے کہا: ''چل نہیں تو نہ سہی، میں خود جگہ ڈھونڈ لوں گا۔''

جیسے ہی واپس مڑا اور قبرستان میں داخل ہوا تو اُس نے پیچھے سے پھر آواز دی۔ ''خبردار اگر کسی دوسرے زمیندار کی قبروں کے احاطے میں قبر بنائی، ورنہ صبح مردہ باہر نکال پھینکیں گے۔ پھر نہ کہنا یہ کیا ہوا۔''

بہرحال جب میں قبرستان کے اندر آیا، جاڑے کی چاندنی رات تھی، گویا دودھ برس رہا تھا۔ پورے قبرستان میں احاطے ہی احاطے تھے اور اندر دو دو تین تین قبریں، باقی جگہ خالی۔ دو تین جگہ مجھے بڑے گنبد بھی نظر آئے۔ حیران کہ اب کیا کروں اور اماں کو کہاں دفن کریں، کہ اتنے میں دور قبرستان کی آخری نکڑ پر لالٹین کی ہلکی روشنی دکھائی دی۔ قریب گیا۔ دیکھا تو میرے چچازاد قبر کھود رہے تھے۔ انھوں نے تھوڑی دیر پہلے ہی چاردیواری کے ساتھ ایک لاوارث جگہ ڈھونڈ نکالی تھی اور اب وہ قبر بنا رہے تھے۔

خیر، رات دو بجے اماں کو دفن کیا۔ جنازے میں کوئی پندرہ لوگ تھے۔ مولوی جاڑے کے ڈر سے نہ آ سکے۔ جنازہ ابا جان نے پڑھا۔

اگلے دن صبح نو بجے چوکیدار نے ابا کو آواز دی کہ حاجی سیف الرحمٰن یاد کرتے ہیں۔ بابا نے مجھے ساتھ لیا۔ حویلی پہنچے تو کوئی سو آدمی بیٹھے تھے۔ جس میں تمام برادریوں کے لوگ موجود تھے۔ دینا گورکن بھی وہاں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیوری چڑھائی۔ ہم سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ابا میاں حیران کہ خیر ہو، خدا جانے کیا بات ہے۔

جب سب بیٹھ گئے تو سیف الرحمٰن کی گرجدار آواز نے سکوت توڑا۔

''میاں تقی محمد، رات تیرے چھوکرے نے دینے سے بدتمیزی کی۔ آدھی رات بڑھیا کی قبر بنواتا پھرتا تھا۔ اور تمھیں یہ بھی پتہ ہے قبرستان میں کمیوں کے لیے مزید جگہ نہیں۔ رات کی بات تو ہم نے پی لی، مگر آئندہ کے لیے سارے کمی اپنا بندوبست کرو۔ قبرستان صرف اُن کے لیے ہے جن کی گاؤں میں زمین ہے۔ آج تک کمیوں کی جو قبریں بن گئیں، وہ بھی ہمارا احسان سمجھو۔ اور سنو، دینے گورکن نے تمھارا کمیوں کا کوئی ٹھیکہ نہیں لیا کہ قبریں کھودتا پھرے۔ میرا پنچایت بلانے کا آج صرف یہی مقصد تھا۔''

یہ کہہ کر حاجی سیف الرحمٰن اُٹھ گیا۔ کس کی مجال کہ دم مارے۔ ہم بھی اپنے گھر چلے آئے۔

دوسرے دن شام کمیوں نے خادم تیلی کے گھر اکٹھ کیا اور فیصلہ ہوا کہ کمی برادری دو کنال جگہ قبرستان کے لیے الگ لے۔ ہر گھر کو اڑھائی سو روپیہ لگا دیا۔ پانچ دن میں پچیس ہزار روپیہ اکٹھا ہوا اور گاؤں سے دو کلومیٹر دور راؤ عبدالشکور سے دو کنال جگہ خرید لی گئی۔ اگرچہ شورزدہ تھی لیکن انھوں نے کون سا فصل بونا تھی۔ البتہ کچھ دور تھی۔

اب جو کمی مرتا اُس کے وارث خود قبر بنا لیتے، اس طرح گورکن کی بھی ضرورت نہ رہی اور مولوی کی کمی اس لیے محسوس نہ ہوئی کہ ابا میاں جنازہ پڑھ دیتے۔

اُدھر زمینداروں کا گورکن دینا تھا جس نے قبرستان کو جنت نشان بنا دیا۔ پکی قبریں اور جگہ جگہ گنبد، ہر طرف سایہ دار درخت؛ پانی کی کمی درمیان سے گزرنے والا نالہ پوری کرتا۔ اب قبرستان میں زمینداروں کے لیے کافی جگہ تھی جو مدتوں کام آتی اور ختم نہ ہو سکتی تھی کہ قبرستان میں ہر ایک نے اپنا قبضہ کر رکھا تھا۔

میں اب کبھی کبھار گاؤں جاتا تو اماں کی قبر پر ضرور جاتا اور ہر طرف سفید مرمریں قبریں دیکھتا۔ یوں دس سال اور بیت گئے۔ کوئی مسئلہ نہ بنا۔ میں نے دیکھا کہ دینا اب بوڑھا ہو چکا تھا مگر قبروں کی دیکھ بھال اُسی محنت سے کرتا۔

اگلی دفعہ چھ ماہ بعد گاؤں گیا تو پتہ چلا کہ آج صبح دینا گورکن مر گیا۔ میں نے یہ خبر فقط سن لی تھی، زیادہ دلچسپی نہ لی۔ حتیٰ کہ شام تک ویسے ہی بھول گیا۔ دوسرے دن دس بجے اپنے گھر میں باوا جان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گرمیوں کے دن اور سخت دھوپ چڑھ آئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اُٹھ کے باہر آیا تو سامنے چوکیدار تھا۔

کہنے لگا، حاجی صاحب حویلی بلاتے ہیں۔ میں باوا جان کو بتائے بغیر حویلی چلا آیا۔ سامنے دیکھا تو حاجی صاحب بڑے موڑھے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسرے لوگ اور کمی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔

مجھے دیکھ کر حاجی سیف الرحمٰن نے کہا: ''میاں تقی نہیں آیا؟''

میں نے کہا: ''چودھری صاحب، وہ ذرا بیمار ہیں۔ آپ حکم کریں۔ میں آ گیا ہوں۔''

کچھ دیر حقہ گڑگڑانے کے بعد بولے:

''تمھیں پتہ ہے، کل دینا گورکن مر گیا اور لاش ابھی تک پڑی ہے۔ کفن دفن کسی نے نہیں دیا۔ گرمیوں کے دن ہیں اور دینے کی لاش بدبو چھوڑنے لگی ہے۔ تمھارا کمی بھائی تھا لیکن تمھیں ذرا خیال نہیں آیا۔ جاؤ اس کا بندوبست کرو۔'' رحیمے کمہار کی طرف دیکھتے ہوئے: ''رحیمے، تم قبر کھودو۔ اور طیفے، تُو دینے کو غسل دے۔ کفن کا بندوبست میں نے کر دیا ہے۔'' اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر: ''علی حسین، تو پڑھا لکھا ہے، ذرا جنازہ پڑھ دینا۔ مولوی آج فارغ نہیں۔''

اتنا کہہ کر حاجی صاحب کھڑے ہو گئے اور مڑتے ہوئے پھر رُکے۔

''اور ہاں، گاؤں کے قبرستان میں جگہ نہیں، اُدھر اپنی طرف ہی لے جانا۔''

نرینہ اولاد

''بابا کا نا ٹیم پیس! بابا کا نا ٹیم پیس!'' کے آوازے کستے ہوئے ہم اس سے دور بھاگ جاتے۔ وہ ہمارے پیچھے گالیاں دیتا ہوا کچھ فاصلے تک بھاگتا، پھر کوئی پتھر اٹھا کر پورے زور سے ہماری طرف پھینک دیتا جو کافی پیچھے رہ جاتا۔ ہم اس کی سخت مزاجی کو جانتے تھے لہٰذا ہمیشہ اس پر اس وقت آوازہ کستے جب ہمیں اطمینان ہوتا کہ پکڑے نہ جاسکیں گے یا اس کے پتھر کی زد سے دور ہیں گے۔

گاؤں کے بچوں کو اس سے کچھ زیادہ ہی چڑ تھی۔ کوئی بچہ ہی ایسا ہوگا جو اس سے مذاق کر کے نہ بھاگتا ہو۔ گاؤں کا یہ واحد نائی تھا جس کی بچوں کے ساتھ یوں کھلے بندوں دشمنی چلی آتی تھی۔ بچے، جن میں میں خود بھی شامل تھا، نہ صرف اس پر آوازے کستے بلکہ شدید نفرت بھی کرتے۔

اس کی ایک آنکھ کانی تھی۔ ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چلتا اور ہر قدم کے ساتھ ساٹھ درجے کے زاویے تک دائیں طرف کو جھک جاتا۔ پاؤں میں ٹائر کے بنے ہوئے جوتوں کے سوا میں نے کوئی جوتا نہیں دیکھا۔ شکل انتہائی کریہہ جسے دیکھنے والے کو گھن آتی۔ جہاں سے گزرتا، بدبو اور تعفن پھیلاتا جاتا۔ شاید عید بقر عید نہاتا ہو، لیکن اکثر یہی کہتے سنا گیا کہ جو بندہ نہانے کے لیے سوا کلو پانی سے زیادہ استعمال کرے گا وہ خدا کا عذاب اٹھائے گا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس کی ایک لنگی اور ایک ہی کرتا تھا۔ گرمیوں میں جب وہ اپنی چارپائی باہر کھلی فضا میں رکھ کر سوتا تو وہی لنگی کمر سے کھول کر اوپر لے لیتا تاکہ مچھروں سے بچا رہے۔ گاؤں کے اکثر لوگوں نے اسے اس بات پر ٹوکا بھی، مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ غالباً نیا کپڑا لینے یا پرانے کو اتار کر دھونے کے جھنجھٹ میں وہ کبھی نہیں پڑا۔ کپڑے دھونا تو دور کی بات، اس نے اپنے چائے اور ہانڈی روٹی کے برتن بھی شاید ہی کبھی دھوئے ہوں، جو اس واحد جھونپڑی میں کھلے پڑے رہتے تھے جس کے آگے نہ کوئی صحن تھا، نہ صحن کی دیوار۔ صبح چائے بناتے ہوئے راہ چلتوں کو نہ کبھی اس نے چائے کی دعوت دی اور نہ ہی کسی نے شریک ہونے کی خواہش کی۔ چائے پی کر اپنے اوزاروں کی پوٹلی کھولتا اور نو بجے تک وہیں بیٹھا دیوار کے سائے میں لوگوں کی حجامت بناتا جو اس کے دروازے پر چل کر آتے۔ اگر کوئی چائے پینے کے دوران آجاتا تو ایسے فقیرانہ استغنا برتتا کہ آدمی رشک سے مر جائے۔ بال کترتے وقت زبان قینچی سے زیادہ چلاتا، اس لیے کہ سالوں بعد اگر کبھی موج میں آتا تو قینچی کا منھ لگوا لیتا۔ اس سے بھی بری حالت ٹنڈ کرنے والی مشین کی تھی جس سے بچے تو بچے بڑوں کے بھی پسینے چھوٹ جاتے۔ بال کاٹنے سے زیادہ کھینچتی تھی۔ اس کے باوجود ہمارا سارا محلہ، جس میں قریب قریب دو سو گھر ہوں گے، سب کے سب اسی سے بال کٹواتے کیونکہ ایک تو اس کا معاوضہ بہت کم تھا اور دوسرا بال کاٹنے یا یوں کہیں ٹنڈیں کرنے میں وقت پر آجاتا۔ ہر گھر میں ٹنڈیں کرنے کی تاریخ اسے ہمیشہ یاد رہتی۔ بعض گھرانوں کی ٹنڈیں تو وہ بغیر معاوضے کے ہی، یعنی صرف روٹی اور چائے پر ہی کر دیتا۔ یوں اس کا زیادہ تر کام بارٹر سسٹم کے مطابق چلتا۔ بالوں کو بناتے ہوئے معتوب کا مشورہ سننا اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ فوراً دھکا دے کر پرے کر دیتا اور اپنی مشین گھتلی میں ڈال لیتا۔ لہٰذا ادھ کھلے کو اپنے مشاورتی الفاظ اسی وقت واپس لینا پڑتے۔

میرے ساتھ اس کی دشمنی اس وقت شروع ہوئی جب میں نے اس سے ٹنڈ کروانے سے انکار کر دیا جو میرے باپ کو بہت برا لگا۔ اس نے چھڑیوں سے مار مار کر مجھے کانا ٹیم پیس کے آگے کر دیا۔ اس دن ظالم نے میرے بال مشین کے ساتھ اتنے اکھیڑے کہ میرے سر کی جلد سوج گئی۔ میں کئی گھنٹے روتا رہا اور رات سوتے وقت کانے ٹیم پیس کے حق میں خلوصِ دل سے بددعائیں کیں کہ یا اللہ صبح یہ زندہ نہ اٹھے۔ مگر وہ یونہی زندہ رہ کر میرے سینے پر مونگ دلتا رہا۔ مجھے ٹنڈ کرانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر کانے سے ٹنڈ کرانے میں قباحت یہ تھی کہ لوگ اور لڑکے پہچان جاتے کہ کانے ٹیم پیس کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہی بات میرے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ اس نے اپنا ایک طبی فلسفہ خاص کر ہر والدین کو ازبر کرا دیا تھا کہ ٹنڈ کرائے رکھنے سے بچہ صحت مند رہتا ہے، خاص کر گردن موٹی رہتی ہے۔

اس کی ایک خصوصیت بہر حال، باوجود اس کے کہ مجھے اس سے شدید نفرت تھی، میں تسلیم کرتا ہوں۔ وہ بغیر گھڑی کے بالکل صحیح وقت بتاتا۔ صرف سورج کو دو تین بار دیکھتا اور اپنا فیصلہ سنا دیتا کہ کتنے بجے ہیں۔ غالباً پانچ سات منٹ سے زیادہ فرق نہ نکلتا۔ مگر یہی خصوصیت بچوں نے اس کی چھیڑ بنا دی۔ رفتہ رفتہ یہ چھیڑ اتنی زیادہ بن گئی کہ کوئی وقت بھی پوچھ لیتا تو یہ اینٹ اٹھا لیتا اور گالیاں دیتے دیتے گاؤں سے چلے جانے کی دھمکی بھی دے دیتا کہ میرے بعد تمھارے بال کوئی نہیں کاٹے گا، پھر سکھ بن جاؤ گے۔

میرے والد نے اکثر اسے کریدنے کی کوشش کی۔ ''میاں شرفو (اصل نام شریف تھا)، آخر تمھارے کہیں بیوی بچے بھی ہوں گے، کوئی اصلی وطن ہوگا۔ کچھ تو خبر کرو۔ کل کلاں خدانہ کرے ایسی ویسی کوئی بات ہوگئی، پھر ہم کس کا منھ دیکھیں گے۔''

''منھ کس کا دیکھنا ہے؟ اگر دفنا نہ سکو تو آگ لگا دینا،'' شرفو نے بگڑ کر جواب دیا۔ لہٰذا مزید پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

مجھے انتہائی خوشی اس بات کی ہوتی کہ شادی غمی میں کانے ٹیم پیس سے کوئی بھی دیگیں نہ پکواتا، نہ کوئی برتن دھلواتا۔ پھر بھی ایسا کمینہ تھا، خود بخود چلا آتا اور نائیوں کو مشورے دینے شروع کر دیتا: نمک یہ ڈالو، مرچ فلاں ڈالو، گھی کم ڈالو، وغیرہ۔ مگر نائی بھی اپنی ہی کرتے، فقط اس سے پیاز کٹوا لیتے۔

چونکہ شرفو کی جھونپڑی ہمارے گھر سے کوئی بیس قدم پر تھی، اس لیے اکثر ٹاکرا ہوتا۔ مجھے نہیں پتہ جب وہ بیمار ہوتا تو اس کی دیکھ بھال کون کرتا تھا۔ ہم نے یا اس کے پڑوس میں دو ایک گھر جو اور تھے انھوں نے تو کبھی نہیں کی۔ کوئی بال کٹوانے جاتا اور وہ کہہ دیتا کہ میں بخار میں ہوں یا سر درد ہے تو اس کا جواب سن کر واپس لوٹ آتا، یہ سوچے بغیر کہ اب اس کے دوادارو کا ذمے دار کون ہے۔ خیر، مجھے ان چیزوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری اور دوسرے کئی بچوں کی خوشی تو اسی میں تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ مر جائے تاکہ ہماری ٹنڈوں سے جان چھٹے۔

یہاں تک کہ چھ سات سال اور نکل گئے۔ رفتہ رفتہ ہم بڑے ہوتے گئے۔ وہ بوڑھا ہوتا گیا۔ اب وہ ہماری مرضی کے بغیر ہماری ٹنڈیں نہیں کر سکتا تھا۔ ہم اسے نزدیک سے بھی آکر چھیڑ سکتے تھے۔

آوازہ کسنے کے ساتھ ساتھ پیچھے سے آ کر دھکا بھی دے دیتے اور بھاگ جاتے کیونکہ اب ایک تو وہ بھاگ نہیں سکتا تھا، دوسرا یہ کہ پتھر اٹھا کر ہمارے پیچھے پھینکنا بھی اب اس کے لیے آسان نہیں تھا؛ بس گالیاں دیتا رہ جاتا جن سے ہم مزید لطف اندوز ہوتے۔

ہمارے گھر سے چالیس قدم مغرب کی طرف ہائی سکول تھا جس میں شیشم، شہتوت اور نیم کے بے تحاشا درخت تھے۔ گاؤں کے اکثر لوگ گرمی سے بچنے کے لیے اپنی چارپائیاں دوپہر کو وہیں لے آتے کیونکہ تین ماہ سکول بند رہتا۔ کانے ٹیم پیں کا بھی سارا دن اب وہیں گزرتا۔ وہیں حاجتیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ کانے ٹیم پیں کے آوازے بھی وہیں کسے جاتے، جس پر بہت ہنگامہ آرائی اور شغل رہتا۔ بعض اوقات گالیاں دیتے دیتے اسے کھانسی کا دورہ بھی پڑتا جس میں اسے کافی تکلیف ہوتی اور سانس ٹوٹنے لگ جاتا۔

سکول کھلتے ہی لوگ بکھر گئے۔ کانا ٹیم پیں اب بیمار رہنے لگا تھا۔ سر مونڈنا بھی کم کر دیے۔ لوگ مذاق کرنا بھی چھوڑ گئے کیونکہ اس نے گالیاں دینا بند کر دیں تھیں، فقط غصے سے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیتا۔ یہاں تک کہ اب بچوں کے مذاق کو بھی سہہ جاتا۔ لیکن بچے باز آنے والے کب تھے۔ جب دیکھتے کہ ہمارے آوازہ کسنے اور دھکا دینے پر بھی چپ رہا تو دور سے کنکر اٹھا کر مارنے شروع کر دیے۔ ادھر یہ کچھ دن تو گزارہ کرتا رہا، آخر تنگ آ کر اپنی جھونپڑی میں ہی بیٹھ رہا، بازار میں آنا جانا چھوڑ دیا۔

اب کوئی اکا دکا اس سے حجامت کروانے جاتا ورنہ اکثر لوگوں نے دوسرے نائیوں کی طرف رجوع کر لیا۔ سردیاں آئیں تو چارپائی پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔

صبح کے وقت میں ادھر سے گزرتا۔ اب میں نے کبھی اسے چائے بناتے اور پیتے نہیں دیکھا۔ شاید ناشتہ ترک کر دیا تھا۔ البتہ حجامت کرنے کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ ایک دن میں صبح اپنے سکول جا رہا تھا کہ کچھ لوگ کانے ٹیم پیں کی جھونپڑی کے گرد کھڑے نظر آئے۔ میں بھی پاس جا کھڑا ہوا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا، "یار، دروازہ توڑ کر تو دیکھو۔" دوسرے نے تائید کی۔

دروازہ توڑا گیا تو عین توقع کے مطابق ٹیم پیں مردہ پڑا ہوا تھا۔ انتہائی گندی رضائی جو سینے تک اوڑھی ہوئی تھی اور منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ منہ اور آنکھیں کھلی تھیں۔ چہرہ نہایت خوفناک ہو گیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ آج مجھے اس کے مرنے کی ذرہ برابر خوشی نہ ہوئی، اور شاید کوئی غم بھی نہیں تھا۔ جھونپڑے میں ایک لوہے کا صندوق، اوزاروں کی گٹھلی اور واحد چارپائی جس پر اس کی لاش پڑی تھی، ان کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔

خیر دو مسلّی بلوائے گئے جنھوں نے اسے نہلایا۔ ایک آدمی نے کفن دے دیا اور شام سے پہلے ہی جنازہ کروا کر اسے دفنا دیا۔ زندگی میں شاید یہ واحد جنازہ تھا جس میں میں نے کسی کو روتے یا آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ اتنی خاموشی سے دفن کر دیا گیا جیسے کوئی مرا ہی نہیں۔ چوتھے دن ایک ادھیڑ عمر شخص آیا جس نے اپنے آپ کو شرفو ٹیم پیں کا بیٹا بتایا۔ لوگوں نے فوراً یقین کر لیا کیونکہ اس کی شکل شرفو سے ملتی جلتی تھی۔ انھوں نے اسے شرفو کی قبر بتائی۔

اگلے دن میں ٹیم پیں کی جھونپڑی کے پاس سے گزرا تو وہی شخص وہاں کھڑا تھا جس کے ساتھ ایک گدھی ریڑھی تھی۔ وہ ٹیم پیں کا بستر، چارپائی، اوزاروں کی گٹھلی اور صندوق ریڑھی پر رکھ چکا تھا اور دروازہ اکھیڑ رہا تھا تاکہ یہ سامان اپنے ساتھ لے جائے۔ آخر وہ ٹیم پیں کا بیٹا تھا، لہٰذا اس کے سوا کون ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ بتا چکا تھا کہ وہ اس کی واحد نرینہ اولاد ہے۔

معمار کے ہاتھ

''حاجی صاحب، ان بچوں کو تعلیم دینا میرے بس میں نہیں، کوئی اور بندوبست کر لیجیے،'' اس نے بیزاری سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا، آپ سے بڑھ کر اور کیا بندوبست ہوگا؟'' حاجی الطاف شرمندگی سے بولا۔ ''ان کمبختوں کی تعلیم کے لیے میں نے شہر کا کوئی بھلا آدمی نہیں چھوڑا۔ مگر ہر کوئی بمشکل ایک مہینہ پورا کرتا ہے۔ سوچا تھا، تم فارغ پھرتے ہو، شریف گھر کے، پڑھے لکھے ہو، کچھ نہ کچھ کر گزرو گے۔ جب تک کوئی ڈھنگ کا کام نہ ملے، ان کو تعلیم دے دو۔''

''حاجی صاحب، آپ کی سب باتیں ٹھیک، مگر یہ آپ کے پوتے مجھ سے ڈرتے نہیں اور سبق پر بھی کان نہیں دھرتے۔ میں ایسے ہی اپنا اور ان کا وقت ضائع کروں گا۔ پھر سارا دن مزدوری کرنے کے بعد تھک جاتا ہوں۔ شام کو یہ مصیبت نہیں اٹھتی۔'' وہ ڈیوڑھی سے باہر نکلتے ہوئے رکا۔ ''اگر آپ کو مجھ سے واقعی ہی ہمدردی ہے تو میری ملازمت کے لیے کچھ اور بندوبست کرا دیجیے۔ یہ بچے تو مجھ سے نہیں پڑھائے جاتے۔''

''چلو کوئی بات نہیں،'' حاجی کہنے لگا، ''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تو مزدوری کرتا ہی بوڑھا ہو جائے اور ساری عمر مسجدوں کے مینار بنانے میں ہی گزار دے۔''

''تو پھر کیا کروں؟'' اس نے جواب دیا۔

''ایک کام کر، تُو میرے بیٹوں کے پاس چلا جا،'' حاجی الطاف نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''وہاں جلد ہی خدا کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔''

''ٹھیک ہے، لیکن ابا سے پوچھ کر بتاؤں گا،'' اس نے چلتے ہوئے کہا۔

اصغر کو باپ کے ساتھ مزدوری کرتے ہوئے اب پورے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر پہلے اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ آیا وہ تر ہو چکی ہے، کیونکہ دیوار ذرا سی بھی خشک ہو تو اس پر پلستر کرنا عذاب ہو جاتا ہے۔ ہاتھ لگانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ ابھی دیوار پلستر کرنے کے قابل نہیں۔ اصغر نے مزدور کو مزید پانی چھینٹنے کا کہا اور پھر اپنے باپ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، جو پلستر شدہ دیوار پر آرائشی ٹائلیں چپکا رہا تھا۔ ٹائلوں کا کام بہ نسبت پلستر کے آسان تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ کام کو اس طرح آپس میں بانٹ لیتے کہ سخت کام وہ اپنے ذمے لے لیتا اور قدرے آسان اپنے باپ کے حوالے کر دیتا۔ اصغر نے دیکھا کہ اس کے باپ کے ہاتھ ٹائل لگاتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ وہ اس کی سفید ریش کو غور سے دیکھنے لگا جس میں سیمنٹ کے چھینٹے سیاہ مٹی کی طرح چپٹے ہوئے تھے اور چہرے کی ہڈیاں کچھ زیادہ ہی ابھر آئی تھیں۔ یہ دیکھ کر اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس کا باپ اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور اس عمر میں اسے کام نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ایک ہنرمند راج گیر تھا۔ شہر کی تقریباً تمام نئی مسجدوں کی تعمیر انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔ باپ کے ساتھ اتنا عرصہ کام کرنے سے اس نے وہ تمام ہنر سیکھ لیا تھا۔

کچھ دیر چپکے سے اپنے باپ کو کام کرتے دیکھتا رہا، پھر اچانک اس نے حاجی الطاف سے ہونے والی کل شام کی گفتگو من وعن سنا دی۔

بات سننے کے بعد اس کے باپ نے کرنڈی تغاری میں رکھتے ہوئے کہا، ''بیٹا، آگے تمھاری مرضی لیکن ایک بات میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آج کل عربوں میں سوائے ذلالت کے کچھ نہیں۔ تیرے سامنے میں تین سال کویت میں رہ آیا، لیکن یہ کرنڈی اور تیسی ہاتھ سے نہ چھُٹی۔ رہی حاجی الطاف کے بیٹوں کی بات، تو اس کا جواب یہ ہے کہ تاجر اور سنیارے میں 'کھال جائے مال نہ جائے' والی بات ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ تیرے یار نہ بنیں گے۔''

اصغر نے تحمل سے باپ کی نصیحت کو سنا۔ لیکن اب وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

جدہ ایر پورٹ پر اترتے ہی وہ امیگریشن کے کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ امیگریشن کے پانچ کاؤنٹر تھے جن پر عملہ موجود نہیں تھا۔ وہ پہلے کاؤنٹر پر لگی ہوئی قطار میں دوسرے نمبر پر کھڑا تھا۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ ہر قطار میں سو سو آدمی جمع ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں احرام باندھے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا گروہ بھی آ گیا جن کے ہاتھوں میں تسبیح اور لمبی داڑھیوں کے ساتھ سر مُنڈے ہوئے تھے۔ امیگریشن ہال میں ان کے دیر سے پہنچنے کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ جہاز سے نیچے اتر کر ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے۔ ان سے ایک عجیب قسم کی پرفیوم کی بُو آ رہی تھی۔ اصغر نے سوچا، اگر وہ زیادہ دیر ان کے ساتھ کھڑا رہا تو اسے قے آ جائے گی۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولا:

''بابا جی، آپ پیچھے قطار میں کھڑے ہوں، اس لیے کہ ہم پہلے سے کھڑے ہیں۔''

''بے فکر رہو بیٹا،'' احرام والا بولا، ''اپنی باری پر ہی پاسپورٹ چیک کروائیں گے۔ ہم جانتے ہیں۔ عمرہ کرنے آئے ہیں، کبھی بے انصافی نہیں کرتے۔''

لیکن جیسے ہی عملے نے کام شروع کیا، احرام والوں نے ایک دھکا بول دیا، قطار میں کھڑے تمام لوگوں کو ایک طرف دھکیل کر آگے ہو گئے۔ اس کشمکش میں اصغر آخر میں جا پہنچا۔ ایک گھنٹے کی ذہنی

اذیت کے بعد جیسے ہی اگلے بوتھ پر گیا، کچھ شُرطوں نے اسے گھیر لیا اور پاسپورٹ چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ حیران تھا کہ اب کیا معاملہ ہے؟ اتنے میں شُرطے نے کہا، ''الا حاجی، خمسون ریال۔''

''لیکن اتنے تو میرے پاس نہیں،'' اس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جواب دیا۔

''تو پھر سیدھے مکہ چلو۔ آپ کا ویزا عمرے کا ہے۔ پاسپورٹ آپ کو مکہ میں ملے گا۔ دوسرے کسی شہر میں جانے کی اجازت نہیں،'' شُرطے نے کہا۔

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایک تو اس کے پاس احرام نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کسی ہوٹل میں قیام کر سکے۔ اس کا ارادہ عمرہ کرنے کا تو تھا، مگر پہلے جدہ میں حاجی الطاف کے بیٹوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ چلتے وقت ان کو فون کر کے اطلاع کر دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ ایر پورٹ پر لینے آ جائیں گے۔ لیکن اب یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کے پاس صرف سو ریال تھے۔ کافی دیر معاملے کی نزاکت پر غور کرنے کے بعد اس نے شُرطے سے کہا، '' کچھ کم نہیں ہو سکتے؟''

''پچاس ریال دو، ورنہ سیدھے مکہ چلو،'' شُرطہ نہایت بے رحمی سے بولا۔

آخر بیچارگی سے اس نے پچاس ریال شُرطے کے ہاتھ میں دیے اور پاسپورٹ لے کر جس قدر جلد ہو سکتا تھا امیگریشن ہال سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس پر ٹیکسی والے ٹوٹ پڑے، مگر وہ ہر ایک کے پاس سے بے نیاز گزر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ حاجی الطاف کے بیٹے اسے لینے کے لیے آئے ہیں۔ باہر آ کر بڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا، ہر طرف دیکھا، لیکن اسے وہ نظر نہ آئے۔ آخر تنگ آ کر ٹیلی فون بوتھ سے انھیں فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ گھر سے ہی نہیں نکلے تھے۔ البتہ انھوں نے پتہ لکھوا دیا اور کہا، ٹیکسی کروا کر خود آ جاؤ۔

بیگ کاندھے سے لٹکائے فون بوتھ سے باہر آ کر وہ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی ایک ٹیکسی والا فوراً بھانپ گیا اور آگے بڑھ کر بولا، ''جناب، پاکستان سے آئے ہو؟''

''جی،'' اس نے کہا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

''بنی مالک،'' اور کاغذ پر لکھا ہوا پتہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کاغذ دیکھ کر واپس کر دیا اور دروازہ کھول کر بیٹھنے کو کہا۔

''پہلے بتاؤ، کیا لو گے؟'' وہ جھجکتے ہوئے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

''بھائی، تم اپنے پاکستان سے آئے ہو، اس لیے چالیس ریال میں پہنچا دوں گا۔''

''چالیس ریال تو بہت زیادہ ہیں۔'' وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔

''پھر آپ کیا دو گے؟''

''بیس ریال۔''

''نہ میاں، بیس ریال تو بہت کم ہیں،'' ڈرائیور نے صاف اردو میں جواب دیا۔ ''یہاں سے جدہ شہر بہت فاصلے پر ہے، اور پھر بنی مالک تو اس سے بھی آگے ہے۔''

بیگ دوبارہ کاندھے سے لٹکا کر وہ ٹیکسیوں کے حلقے سے باہر نکل کر سوچنے لگا، کیوں نہ شہر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر کسی سے لفٹ لے لے۔ اس طرح پیسے بھی بچ جائیں گے۔ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایر پورٹ کافی پیچھے رہ گیا۔ سڑک کے دونوں طرف کھجور کے جھنڈ تھے۔ اس نے اپنا بیگ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ رکھ دیا اور چاند کی روشنی میں کھجوروں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر دور تک پھیلے صحرا میں کھجور کے درختوں سے چھن کر گرتی چاندنی اسے ایک عجیب طلسمات میں لے گئی۔ پکی ہوئی کھجوریں بڑی تعداد میں ریت پر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ اصغر نے جھک کر ایک کھجور اٹھائی اور کھائی۔ کھجور اتنی میٹھی تھی کہ کبھی ایسی لذت نہ ملی تھی۔ وہ چاند کی روشنی میں اور کھجوریں چن چن کر کھانے لگا۔ ہوا سے ہلتے ہوئے کھجوروں کے پتے اس پر سحر طاری کر رہے تھے۔ جب دور سے کسی کار کی روشنی دیکھتا، فوراً سڑک پر آ کر ہاتھ کا اشارہ کر دیتا، مگر کار فراٹے سے گزر جاتی۔ اسے کار کے گزرنے پر کوئی افسوس نہ ہوتا، اس لیے کہ کھجوریں کھانے میں کافی مزہ آ رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے تک وہ کھجوروں کے جھنڈ میں پھرتا رہا۔ بہت سی کھجوریں چُن کر اس نے اپنے بیگ میں بھی ڈال لیں۔ اسی دوران صبح کی اذان ہو گئی۔ اذان سنتے ہی وہ دوبارہ سڑک پر آ گیا اور واپس ایر پورٹ کی طرف چل پڑا۔ اب وہ کھجوروں سے اکتا چکا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد شہر پہنچ جائے۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں کوئی لفٹ نہیں دے گا کیونکہ وہ پاکستان کو پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ لہٰذا ٹیکسی سٹینڈ پر واپس آ گیا۔

عصر کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایر کنڈیشنر نے کمرہ اس قدر ٹھنڈا کر دیا تھا کہ اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ ایسے کمرے میں سونے کا آج پہلا اتفاق تھا۔ اصغر نے محسوس کیا جیسے جسم اکڑ گیا ہو۔ وہ کمرے سے باہر آیا تو گرم ہوا نے منہ جلا کے رکھ دیا۔ ایسی ہواؤں کا سامنا اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ خیر، وضو کر کے دوبارہ کمرے میں آیا اور عصر کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ دیر دعائیں مانگتا رہا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی نماز قضا نہیں کرے گا، اور جیسے ہی کام پر لگ گیا، فوراً گھر اطلاع دے گا۔

وہ یہ سوچ کر لطف لینے لگا کہ جن جگہوں کا تاریخ کی کتابوں اور اساطیر کے حوالوں میں ذکر پڑھتا آیا ہے، کل انھیں عین اپنی آنکھوں کے سامنے پائے گا۔ انھی خیالات میں گم شام کے وقت حاجی ناصر کے ساتھ جدہ کی گلیوں میں پھرتا رہا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہزاروں پاکستانی، ہندوستانی اور بنگالی گھومتے پھرتے ہیں۔ بعضوں نے بڑی بڑی ہوٹلیں، ریستوران اور دوسرے کاروبار چلا رکھے ہیں۔ کچھ ایسے بھی نظر آئے جو مانگتے پھرتے تھے۔ وہ ایک جگہ پہنچے جہاں بہت سے ہندوستانی لڑکے، گروہ کے گروہ، کھڑے تھے۔ اس کے پوچھنے پر حاجی ناصر نے بتایا، یہ لڑکے اسی طرح چوراہوں میں کھڑے ہو کر عربوں کو بلیو فلمیں بیچتے ہیں۔ کچھ لڑکے خود بھی ساتھ بک جاتے ہیں۔ گلی کوچے اور بازار دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ اذان کے ساتھ ہی دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ بند ہونے لگے۔ ریستورانوں کے دروازوں پر وقفۂ نماز کے بورڈ ابھر آئے۔ ہزاروں طرح کی مخلوقات اپنی جیبوں سے ٹوپیاں نکالتے ہوئے مسجدوں کی طرف بھاگی۔ کوئی ذی روح اس وقت سستی نہیں دکھا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی انھی میں شامل ہو گئے۔

رات اس نے انتہائی بے چینی میں کاٹی۔ حرم کی زیارت کے شوق میں نیند اڑ گئی تھی۔ وہ یہ سوچتا رہا کہ کتنے ایسے بدنصیب ہیں جو کروڑوں روپے کے ہوتے ہوئے بھی حجازِ مقدس کی زیارت سے محروم

ہیں۔انھی خیالات میں خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔وہ جلدی سے اٹھا،غسل کیااور احرام باندھ لیا۔حاجی ناصر نے اسے تین سو ریال اور عمرے کے لیے احرام ادھار دے دیا تھا۔وہ دس ریال کرائے پر ایک ٹیکسی میں سوار ہو گیا جس میں تین آدمی پہلے بھی موجود تھے۔ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس نے بے چینی کے ساتھ ڈرائیور سے سوال کیا،''میاں،حرم کتنے فاصلے پر ہوگا؟''

''ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گے،''ڈرائیور نے جواب دیا۔

''کعبے کا رقبہ کتنا ہوگا؟''اصغر نے دوبارہ پوچھا۔

''مافی معلوم یا اخی،''ڈرائیور نے نہایت سفاکی سے کہا۔

ڈرائیور کے اس دوٹوک جواب سے وہ دبک کر بیٹھ گیا اور سیٹ کے ساتھ سر لگا کر بڑے انہماک سے سڑک کے دو طرفہ خشک پہاڑوں اور ریگستانوں کو دیکھنے لگا۔کبھی پہاڑ کے دامن میں کوئی ہٹ نظر آتا اور پیچھے گزر جاتا،کبھی ہوا کا بگولا ریت اڑاتا ہوا آسمانوں کی طرف اٹھ جاتا۔وہ دل میں گمان کرتا،شاید ان رستوں پر بھی پیغمبرِ اسلام گزرے ہوں۔اگرچہ ٹیکسی کی رفتار بہت زیادہ تھی لیکن اسے یہ سفر بڑا طویل لگا۔وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔آخر اس نے اپنا دماغ تاریخ کے چودہ سو سال پرانے جھمیلوں میں مصروف کر لیا۔رسولِ پاک کی دعوتِ عام،ابو طالب کی حمایت،ہجرت،جنگِ بدر،احد،خندق...

وہ انھی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے یہ کہہ کر چونکا دیا،''بھائی اترو،حرم آ گیا۔''یہ سن کر وہ جلدی سے کپڑوں کا بیگ سمیٹ کر باہر نکل آیا۔سامنے حرم کا مشرقی دروازہ ایک طلسماتی ہیبت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

وہ کھنچتا ہوا آگے بڑھا۔نسل نسل کے کالے گورے لوگ بغیر اجنبیت کے گھوم رہے تھے۔ہزاروں کبوتر بے خطر اڑتے اور دوڑتے پھرتے تھے۔اگرچہ گیارہ کا عمل تھا مگر دھوپ کے باوجود اسے گرمی نہیں لگ رہی تھی۔وہ حرم کے اندر داخل ہوا،نفل پڑھے اور مناسکِ عمرہ میں مشغول ہو گیا۔کعبے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اللّٰھم لبیک کہتے ہوئے طواف کیا۔اگرچہ ہجوم بہت زیادہ تھا لیکن اس نے ہر طوف پر حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔پھر صفا و مروہ کی سعی کی۔صفا پہاڑی پر سفید لباس میں پریوں کے جھرمٹ اسے اپنی طرف کھینچتے رہے،مگر آج وہ اس قسم کے کسی جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔سعی کرنے کے بعد دوبارہ کعبے کے پاس آ گیا۔پھر اچانک اس نے مقامِ ابراہیم کو بوسہ دیا تو پاس کھڑے ایک شُرطے نے اس کے کاندھوں پر چھڑی دے ماری۔

''لا،لا،حاجی،ہذا الشرک۔''

''انا العالم،''اصغر نے جواب دیا۔

''لا،لا،انت الجاہل،''شُرطہ چیخ کر بولا اور چھڑی دوبارہ پیٹ میں چبھو دی۔

اسے شُرطے پر غصہ تو بہت آیا لیکن نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ عبادت میں مشغول ہو گیا۔عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا تصور تاریخ سے جوڑے رکھا تاکہ کعبے کی زیارت کا صحیح لطف آئے،اور حرم کی ہر اس چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جس کے بارے میں اس نے کچھ بھی پڑھ سن رکھا تھا۔بڑی دیر تک غلافِ کعبہ پکڑے ہوئے دعائیں مانگتا رہا۔تمام دن حرم میں گزار کر شام سے کچھ پہلے باہر نکل آیا۔

عمرے سے فارغ ہو کر وہ کچھ دوسرے مقامات بھی دیکھنا چاہتا تھا،لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے اس نے انھیں کل پر ٹال دیا اور ایک کھلے میدان میں بیگ سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔یہ جگہ ابو طالب کے گھر کے پاس کوہِ ابو قبیس کے پہلو میں تھی۔وہاں اس جیسے دوسرے کئی لوگ سو رہے تھے جو ہوٹل میں رہنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔نیند کا غلبہ اس قدر زیادہ تھا کہ اسے کچھ خبر نہ رہی،حتیٰ کہ ایک شُرطے نے اذانِ صبح کے وقت اسے ٹھوکر مار کر اٹھایا۔

نماز پڑھتے ہی وہ مکہ کے کوچوں میں نکل گیا۔گلیاں اور سڑکیں انتہائی صاف پتھر لگا کر پختہ کی گئی تھیں۔پھرتا پھراتا اور پوچھتا ہوا مقامِ حجون پر گیا۔یہاں خاندانِ رسالت اور بنی ہاشم کی قبریں تھیں۔ظہر تک اس نے کئی مقامات کی زیارت کر لی اور مسجدِ حرام میں آ کر نمازِ ظہر ادا کی۔پھر اس کا یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔صبح پیدل نکل جاتا،مکہ کی وادی میں گھومتا پھرتا اور سہ پہر سے پہلے واپس آ جاتا۔

آج اس کا مکہ میں آٹھواں دن تھا۔کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے بھی ایک سو چالیس ریال خرچ ہو چکے تھے۔اس نے سوچا،اب اسے جلد مدینہ چلے جانا چاہیے اور وہاں کی زیارت کے بعد فوراً کام پر لگ جانا چاہیے۔

تیس ریال کا ٹکٹ لے کر وہ بس میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک پندرہ سولہ سال کا سیاہ فام لڑکا دو بچیوں کے ساتھ سوار ہوا۔غالباً وہ دونوں اس کی چھوٹی بہنیں تھیں۔تینوں اگرچہ کالے تھے لیکن نین نقش میں ایک کشش اور معصومیت ضرور تھی۔دونوں لڑکیاں ایک سیٹ پر بیٹھ گئیں۔لڑکے نے چاروں طرف ایک نگاہ ماری،پھر اصغر کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔کچھ ہی دیر میں بس چلی تو سیاہ فام لڑکے نے سکوت توڑا۔

''ما اسمک؟''

''اسمی علی اصغر۔''

''جزاک اللہ واسمی عبداللہ،''سیاہ فام لڑکے نے کہا اور اس کے بعد مختلف ممالک کی کرنسی نکال کر دکھانے لگا۔اس نے بتایا کہ اس کے ہر ملک میں دوست موجود ہیں،امریکہ،یورپ،افریقہ،عراق،شام،ہندوستان اور ایران میں۔

''کیا پاکستانی کوئی دوست نہیں؟''اصغر نے پوچھا۔

''لا،لا کل باکستانی حرامی کل سارق،''وہ ایک دم بگڑ کر بولا۔''لا واحد رفیقی من باکستان۔''

یہ سن کر اصغر کا رنگ اڑ گیا اور اس نے منھ دوسری طرف کر لیا۔

چند ثانیے اسی خاموشی میں گزرے تھے کہ لڑکا پھر بولا۔ ''وانت من الایران؟''

''لَم ولکن من الباکستان،'' اصغر نے روکھے انداز میں جواب دیا۔

سیاہ فام لڑکے کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔ غلطی سے وہ اسے گورے رنگ اور تیکھے نقوش کی وجہ سے ایرانی سمجھے ہوئے تھا۔ اس کے بعد مکمل سکوت چھا گیا۔

مدینہ میں آج اس کا پانچواں دن تھا۔ مسجد نبوی، احد، خندق اور ہر اس جگہ کی اس نے زیارت کی جس کے بارے میں اسے کچھ بھی علم تھا۔ وہ رات دن مدینے کے کھلے بازاروں اور صاف ستھری سڑکوں پر پھرتا اور مضافات میں موجود کھجوروں کے باغوں کی سیر کو نکل جاتا۔ اسے مدینے کے مغرب میں عقیق کی زمین روزانہ عصر کے بعد اپنی طرف کھینچ لیتی، جہاں کھجوروں کی سرسبز و شاداب وادی میں سورج کا نظارہ کرتا، جو آسمان پر اڑتی چھوٹی چھوٹی بدلیوں کو سرخ و سنہری قبائیں پہنا کر شام ڈھلے ہی خشک پہاڑیوں کے اس پار چھپ جاتا تھا۔ حرمِ رسول کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی دیر تک درود و سلام پڑھتا۔ اسے ان بد بخت ایرانیوں پر تعجب تھا جو کپڑے کے تھیلوں میں اپنے جوتے ڈال کر مسجد میں لیے پھرتے اور مسجد کی بے حُرمتی کرتے تھے۔

آج وہ چاہتا تھا کہ جی بھر کر مدینے کو دیکھ لے، پھر کبھی آنا نصیب ہو یا نہ ہو۔ اسی احساس سے وہ مسجدِ نبوی اور مدینے کی تمام زیارات کرنے کے بعد مغربی حصے کی سیر کے لیے نکل گیا۔ ابھی ایک فرلانگ طے کیا تھا کہ اسے ایک زیرِ تعمیر پلازا نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس میں داخل ہو گیا اور سوچا، اگر اسے یہاں بطور راج گیر کام مل جائے تو کیا اچھا ہو۔ اس طرح وہ مسلسل مدینے میں رہ سکے گا اور زیارات کے علاوہ روزی بھی کما سکے گا۔ یہ سوچتے ہی اسے ایک مسرت کا احساس ہوا۔ اصغر نے سپروائزر کا نام پوچھ کر اسے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیا کر سکتے ہو؟'' سپروائزر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''راج گیری کا تمام کام کر لوں گا،'' اس نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''ویزا عمرے کا لائے ہو کیا؟'' سپروائزر نے دوسرا سوال کیا۔

''ویزا تو عمرے کا ہے، لیکن اگر آپ کام پر لگا لیں گے تو آہستہ آہستہ کام کرنے کا پرمٹ بھی بن جائے گا۔''

''اچھا، اس دیوار کو ایک فٹ تک تعمیر کر کے دکھاؤ،'' سپروائزر نے تقریباً دس فٹ لمبی زیرِ تعمیر دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے کام ملنے کی امید میں تیزی سے آگے بڑھ کر اوزار پکڑے اور ایک ماہر کاریگر کی طرح دیوار تعمیر کرنے لگا، حتیٰ کہ کچھ ہی دیر میں ڈیڑھ فٹ دیوار اوپر اٹھا دی، جسے دیکھ کر سپروائزر کی آنکھیں کھل گئیں۔ نمازِ مغرب کے بعد سپروائزر نے اسے کھانا کھلایا اور بتایا کہ وہ بھی گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے۔ دس سال پہلے سعودی عرب آیا تھا۔ اس وقت سے مختلف شہروں میں کام کرتا رہا۔ لیکن پچھلے پانچ سال سے اب وہ مدینے ہی میں ہے۔ سپروائزر نے بتایا کہ وہ بھی پہلے راج گیری کرتا تھا، مگر اقبال صاحب کی مہربانی سے اب اس کی جان اس کام سے چھوٹ گئی۔ ''کل جمعہ ہے، پرسوں آ جاؤ۔ میں اقبال صاحب سے بات کر کے آپ کو رکھ لوں گا۔''

''یہ اقبال صاحب کون ہیں؟'' اصغر نے پوچھا۔

''وہ انجینئر ہیں۔ لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کئی کام انھی کی نگرانی میں ہوئے ہیں۔''

''تو ابھی کام پر کیوں نہیں لگا لیتے؟'' اصغر بے چینی سے بولا۔

''بھائی، یہاں بہت خطرہ ہے۔ یہ جو شُرطے گھومتے پھرتے ہیں، یہ تین تین دفعہ چیک کرتے ہیں کہ کوئی آدمی بغیر پرمٹ کے کام پر تو نہیں لگا۔ انجینئر صاحب کسی سے بات کریں گے، اس کے بعد آپ کو کام دیں گے۔''

عشا کے بعد وہ واپس مسجدِ نبوی کے صحن میں آ گیا اور خوش تھا کہ روضۂ رسول کی برکت سے اسے جلد کام مل جائے گا۔

اب اصغر کے پاس کل پچاس ریال تھے۔ اس نے خیال کیا اگر دو تین دن میں کام مل جائے تو وہ جدہ نہیں جائے گا، یہیں رہے گا، اور صبح و شام روضۂ رسول کی زیارت کرے گا۔ اس خیال سے وہ جھوم سا گیا اور اپنے جوتے مسجدِ نبوی کے دروازے پر اتار کر اندر چلا گیا۔ دیر تک حرمِ نبی کے پاس بیٹھا رہا۔ رات دس بجے انتظامیہ نے جب مسجدِ نبوی تمام لوگوں سے خالی کروائی تو وہ بھی باہر نکل آیا اور جوتے ڈھونڈنے لگا، مگر ہزار کوشش کے باوجود جوتے نہ ملے۔

رات اس نے ننگے پاؤں ہی گزاری۔ وہ ایک پلازے کی دیوار کے ساتھ کپڑوں کا بیگ سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ دوسرے دن صبح کی اذان کے ساتھ جاگ گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے پاس ہی ایک لڑکا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ دونوں مسجد میں آئے۔ نماز سے فارغ ہو کر باتیں کرنے لگے۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''اوکاڑہ سے آیا ہوں،'' اصغر نے جواب دیا۔

''کوئی کام ملا؟''

''ابھی نہیں۔ کسی نے وعدہ ضرور کیا ہے۔ اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''میں رائے ونڈ کے ایک قصبے راجہ جنگ کا ہوں۔ میرا نام نوید ہے۔ دو سال سے یہاں ہوں۔ آج کل کوئی کام بھی نہیں اور پیسہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ رات تمھیں سوتے ہوئے دیکھا تو سوچا، پاکستانی ہے، دوستی ہو جائے گی۔ ویسے کیا کر سکتے ہو؟''

اصغر نے کہا، ''ٹائل، پلستر، پینٹنگ، شیشے کا کام اور معماری جیسا ہر کام کر لیتا ہوں۔''

نوید کہنے لگا، ''احد پہاڑ کے دوسری طرف ایک بستی ہے۔ وہاں ایک بنگالی میرا دوست ہے۔ وہ بھی معماری کا کام کرتا ہے۔ اگر کام کرنا چاہو تو میں تمھیں اس کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ میرا خود بھی اسی کے ساتھ مزدوری کرنے کا ارادہ ہے۔ دوسری سہولت یہ کہ شرطوں کا ادھر نام ونشان بھی نہیں۔''

صبح دس بجے سے پہلے وہ احد کی بستی میں پہنچ چکے تھے۔ ناشتہ اور ٹیکسی کا کرایہ دینے کے بعد اس کے پاس صرف پندرہ ریال بچ گئے تھے۔ بنگالی گھر پر نہیں تھا، اس لیے شام تک اس کا انتظار کرنا پڑا۔ اصغر نے چاہا کہ چھوٹے موٹے جوتے خرید لے تاکہ ننگے پاؤں کی خجالت سے بچے۔ وہ دونوں اس بستی کے ایک چھوٹے بازار میں گئے، مگر کوشش کے باوجود انھیں ایسا کوئی جوتا نظر نہ آیا جس کی قیمت پچیس ریال سے کم ہوتی۔ پتھریلی زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ پاؤں زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ سورج جیسے جیسے بلند ہو رہا تھا، تپش سر کو پہنچنے لگی۔ دہکتے کنکر تلووں کو کاٹتے ہوئے اندر گھس جاتے۔ آخر وہ دونوں ایک کھجور کے سائے میں بیٹھ گئے۔ سہ پہر کے وقت اس نے نوید کو پانچ ریال دیے کہ ہوٹل سے کھانا لے آئے، اس لیے کہ اب وہ ننگے پاؤں ہوٹل تک نہیں جا سکتا تھا۔ نوید کھانا لایا تو وہ کھانا کھا کر وہیں پر لیٹ گئے، حتیٰ کہ شام ہو گئی۔

''میں آپ کو پچاس ریال فی یوم مزدوری دیا کروں گا،'' بنگالی نے پان کی رال منھ سے گراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، کھانے اور رہائش کا تم سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ کام اگر ستھرا نہ کرو گے تو مزدوری کاٹ لی جائے گی۔ اور چھٹی کے روز کا کھانا تم اپنی جیب سے کھاؤ گے۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ تمھاری مرضی۔ اور ہاں، ایک بات بتاؤں، تمھیں کام پر لگانے کا خطرہ میں اپنی ذمے داری پہ لے رہا ہوں۔''

بنگالی کی باتوں کے دوران وہ کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ چٹائی، بستر، کھانے کے برتن جو نہایت گندے تھے، ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان سے ایک عجیب قسم کی الجھن ہو رہی تھی۔ کمرے کی ہر شے، بنگالی سمیت، اتنی گندی اور بدبودار تھی کہ اسے کراہت ہونے لگی اور جی اوبنے لگا۔ خاص کر جب بنگالی بات کرتا، پان سے آلودہ کالے سیاہ دانت اسے ایک خوف میں مبتلا کر دیتے۔ لہٰذا وہ بجائے بنگالی کی شرائط پر کان دھرنے کے اسی بات پر غور کرتا رہا کہ یہاں رات کیسے کاٹی جائے۔

صبح ہوتے ہی اس نے نوید کو جگایا اور وہ بغیر بتائے چل دیے۔ ٹیکسی کا کرایہ نہ تھا، اس لیے بجائے پہاڑ کا چکر کاٹنے کے انھوں نے فیصلہ کیا کہ پہاڑ پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جاتے ہیں، اس طرح جلد ہی میدانِ احد میں پہنچ جائیں گے۔ پھر وہاں سے مسجدِ نبوی تین کلومیٹر پر ہی تو ہے۔ لیکن جب وہ کافی اونچا چڑھ گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ کام جتنا آسان سمجھ رہے تھے، کچھ ایسا سہل بھی نہیں۔ رفتہ رفتہ سورج کی شعاعوں نے خشک پتھروں کو اس طرح تپا دیا کہ پاؤں رکھنا عذاب ہو گیا۔ اُدھر پہاڑ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک چٹان ختم ہوتی تو سامنے دوسری آموجود ہوتی۔ اصغر کے پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ جلن کی شدت تکلیف دے رہی تھی۔ خدا خدا کر کے دو بجے سہ پہر وہ چوٹی تک پہنچے، لیکن اب اترنا چڑھنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ہر طرف بکھرے ہوئے نوک دار گرم پتھر اور کنکر دیکھ کر اس کا دل سہم گیا۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تو بہت تھیں لیکن سایہ نام کو نہیں تھا۔ اس پر ستم یہ کہ پیاس اور دھوپ کی شدت نے رہی سہی کسر نکال دی۔ آخر اس نے نوید سے کہا، ''بھائی، میں تو اب نہیں چل سکتا،'' اور ایک چھوٹی سی غار میں ڈھیر ہو گیا جس کے پاس ہی ببول کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ کافی دیر لیٹے رہنے کے بعد درد کی ایک شدید لہر سے، جو اس کے پاؤں سے اٹھی، اصغر کی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا جو اب سوج چکے تھے۔ دور سے مغرب کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ سامنے مسجدِ نبوی کے مینار بھی صاف دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسلسل چار گھنٹے سوئے تھے۔ مگر اب بھوک اور پیاس اپنا کام دکھانے لگی۔ چاند مشرق کی طرف سے ابھر آیا تھا۔ انھوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ پتھروں میں گرمی قدرے کم ہو چکی تھی۔ خشک پہاڑوں کے سکوت میں نرم ہواؤں کا لمس بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے پھوٹ بہے تھے جن سے اب خون بہنے لگا تھا، لیکن پہاڑ کے اوپر چاند کے سائے میں وہ اپنا سفر ملتوی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مسلسل چلتے رہے، لیکن کہاں تک؟ بھوک اور پیاس کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آخر گیارہ بجے کے قریب وہ ایک جگہ پھر لیٹ گئے۔ اصغر کے پاؤں اب اس قدر چھلنی ہو چکے تھے کہ جس پتھر پر رکھتا، وہ رنگین ہو جاتا۔ درد کی ٹیسیں شدت اختیار کر چکی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

آنکھ کھلی تو اصغر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ شبنم کے قطروں سے چہرہ بھیگ چکا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر کی لیکن نوید وہاں نظر نہ آیا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد آواز دی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سورج آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ اصغر نے اٹھ کر چلنے کا ارادہ کیا لیکن جیسے ہی بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا، اسے ایک دھچکا سا لگا۔ کپڑوں والا بیگ وہاں موجود نہیں تھا، جس میں اس کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات بھی تھے۔ پھر غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب میں چلا گیا، لیکن وہ بھی خالی تھی۔ نوید اس کا بیگ اور دس ریال کی پونجی لے کر جا چکا تھا۔

بہر حال وہ خدا کا نام لے کر چل پڑا۔ گرتا پڑتا، تین گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد پہاڑ سے نیچے اترا۔ پیاس کی وجہ سے جان نکلی جا رہی تھی۔ اس نے پانی کے لیے بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک ایک لوہے کا ڈرم نظر آیا۔ قریب ہی بکریوں کا ایک باڑا تھا۔ باڑے میں سوکھی گھاس کے گٹھے پڑے ہوئے تھے، جنھیں بکریاں کڑکڑ کر کے کھا رہی تھیں۔ اصغر نے بے تابی سے ڈرم میں ہاتھ ڈالا اور بکریوں کا استعمال شدہ پانی اوک سے حلق میں انڈیل لیا۔ پانی اتنا گرم تھا کہ وہ سینے کو چیرتا ہوا معدے میں اتر گیا جہاں جا کر اس نے مزید آگ لگا دی۔ آنکھیں ابلنے لگیں۔ خیر کسی نہ کسی طرح سے اصغر نے میدانِ احد کا رخ کیا اور اپنے تمام حواس کو مجتمع کرتے ہوئے، جس قدر ہو سکتا تھا تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کی۔ میدان کے قریب پہنچا تو سامنے والے گھر کے دروازے پر ایک دس بارہ سال کا لڑکا نظر آیا۔ وہ جلدی سے دیوار کے سائے میں گر گیا اور بچے کو اشارے سے پانی کے لیے کہا۔ ٹھنڈے پانی سے پیٹ بھر کر اس کی جان میں جان آئی۔ ابھی وہ لڑکے کو کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اندر ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

بالآخر نقاہت اور کمزوری کے ساتھ وہ زخمی پاؤں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسجدِ امیر حمزہ میں داخل ہو گیا اور منھ پر اچھی طرح سے پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر دیوار کے ساتھ بیٹھ کر پاؤں کو سہلانے لگا۔ بھوک نے اب اسے بے بس کر دیا تھا۔ لیکن کسی سے مانگنے کی نوبت آج تک نہ آئی تھی۔ وہ جلد کسی نہ کسی طرح کھانے کا بندوبست کرنا چاہتا تھا، مگر ننگے اور زخمی پیروں کے ساتھ دھوپ میں نکلنے کے تصور سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سوجے ہوئے پیروں سے خون ابھی تک رس رہا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھا کہ کیا کرے، کہ اتنے میں عصر کی اذان ہو گئی۔ لوگ نماز کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ اسی لمحے اس

کے ذہن میں ایک انوکھا خیال بجلی کی طرح کوندا۔ وہ جلدی سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا، ایک عربی نہایت نفیس لباس میں آیا اور اپنے جوتے مسجد کے دروازے کی بیرونی چوکھٹ پر اتار کر اندر داخل ہو گیا۔ جوتے بہت عمدہ چمڑے کے تھے۔ عربی کے مسجد میں داخل ہوتے ہی اصغر جوتے پہن کر تیزی سے مڑا لیکن دروازے کے پاس کھڑے چوکیدار نے اسے پکڑ لیا اور ''سارق! سارق!'' کی آواز بلند کر دی۔ تمام لوگ دوڑے آئے، جیسے اچانک کوئی تماشا لگ جائے۔ کسی نے تھپڑ اور کسی نے لات ماری۔ عربی نے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ دو لوگوں نے مل کر مشکیں کس دیں۔ وہ سب اسے عربی میں نہ جانے کیا کیا سوال پوچھتے رہے، جن کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ بلکہ بھوک سے نڈھال ہونے کی وجہ سے اب وہ کچھ سن بھی نہیں رہا تھا۔

''جنابِ عالی، میری آنکھوں کے سامنے اس بدبخت نے شریف نمازی کے جوتے چرائے ہیں۔ یہ دونوں عادل گواہ اور ان کے علاوہ دوسرے بھی کئی لوگ موقعے پر موجود تھے،'' چوکیدار شرعی عدالت میں گواہی دیتے ہوئے بولا۔ چوکیدار کے بعد شاہدین نے باری باری گواہی دی۔

''لیکن ملزم کو صفائی کا موقع ضرور ملنا چاہیے،'' قاضی نے ترجمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ترجمان کے تین بار پوچھنے پر بھی وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ دراصل اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کانوں میں فقط سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی، بلکہ اسے اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کو یہاں کس لیے لایا گیا ہے۔

ملزم کی خاموشی اور خستگی کی وجہ سے قاضی کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک عادی مجرم اور پیشہ ور چور ہے۔ بالآخر عدل اور شرعی قانون کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے قاضی نے اپنا فیصلہ سنا دیا، جسے مجرم کے علاوہ تمام لوگوں نے سنا اور تحسین کی۔

صبح کی اذان کے بعد جب اسے ہاتھ کاٹنے کے لیے بندی خانے سے باہر لایا گیا تو وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک ماہر کاریگر ہے، حتیٰ کہ اسے اپنے بوڑھے باپ کی شکل بھی یاد نہ رہی تھی۔

اچھو بازی گر

''اگر میرا باپ بھی بازی گر ہوتا تو پھر دیکھتا کہ اچھو کیسے جیت جاتا۔ اس کو چھلانگ لگانے کے سارے گُر اس کے باپ نے بتائے ہیں۔ تمھیں پتہ ہے؟ نورو بازی گر دن رات اسے ورزش کرواتا ہے۔''

میں نے یہ بات اپنی خفت مٹانے کے لیے اور اپنے جگری یار محانے کو تسلی دینے کے لیے کی جو میری ہی طرح نرم و نازک اور خوبصورت تھا۔ اس کو میری شکست کا واقعی دکھ تھا۔

''چھلانگ میں جیت گیا تو کیا ہوا؟'' محانے نے کہا، ''کلاس میں نمبر تو ہمارے ہی زیادہ آتے ہیں۔''

''پرسوں دیکھا، ماسٹر اشرف نے کیا کہا تھا؟ اچھو، تُو صرف چھلانگیں ہی لگا سکتا ہے۔ پڑھنا تیرے بس کا روگ نہیں،'' میں نے محانے کی بات کی مزید وضاحت کی۔

اتنا کہہ کر ہم نے دل کا غبار تو نکال لیا، مگر مجھے معلوم تھا کہ میں تو کیا محانا بھی اندر سے مطمئن نہیں تھا۔

پھر ایک دن جب ہیڈ ماسٹر نے اچھو بازی گر کو قلابازیاں لگانے پر پچاس روپے اور تھپکی دی تو ہم اور بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ کیسے اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔ اس کے باپ کو سکول میں بلا کر اچھو کی کھیلوں میں بہتر کارکردگی پر مبارکباد دی۔ خدا جانتا ہے کہ وہ دن میرے حسد اور رشک کی انتہا کا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے شکوہ کیا کہ اس نے ہمیں کیوں نہ بازی گر بنایا۔

اُس دن نورو بازی گر نے خوشی سے وہ ڈھول بجایا کہ کان پھٹنے لگے۔ کلاس کے تمام لڑکے، سوائے میرے اور محانے کے، اچھو کی ہی تعریفیں کرتے رہے۔

سکول میں وقفۂ تفریح کے دوران اکثر فٹ بال کے میچ کھیلے جاتے۔ اس کے لیے جب کھلاڑیوں کی دو طرفہ تقسیم ہوتی تو ہر فریق اچھو کو اپنی ٹیم میں رکھنے کی خواہش کرتا۔ حتیٰ کہ اس کے لیے ٹاس کی جاتی۔ جبکہ ہم دونوں نے کھیلنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ کھیل کے دوران کوئی ہمیں کہنی مارتا اور کوئی ٹانگ اڑا کر گرا دیتا۔ خاص کر اچھو کے تو سامنے آتے ہماری جان جاتی۔ رفتہ رفتہ پوری کلاس میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک طرف میں اور محانا اور دوسری طرف اچھو اور ساری کلاس۔ اگر شہر ہمارے گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہ ہوتا، یا گاؤں میں کوئی اور سکول ہوتا، تو ہم یقیناً وہ سکول چھوڑ دیتے مگر اب مجبوری تھی۔ ادھر روز بروز اچھو کی بدمعاشیاں بڑھتی گئیں۔ اس کے دو ہی کام رہ گئے تھے، لمبی لمبی چھلانگیں لگانا اور ہم دونوں کو تنگ کرنا۔ اس پر ستم یہ کہ اسے کلاس کا مانیٹر بھی بنا دیا گیا۔ اب ہماری جان اور شکنجے میں آ گئی۔ اساتذہ کو شکایت کرنے کی ہمت بھی نہ رہی کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اور زیادہ تنگ کرتا۔

ایک دن استاد کی غیر موجودگی میں میں اور محانا کلیلہ و دمنہ کی کہانی پڑھ رہے تھے، دوسرے لڑکے اچھل کود اور دھینگا مشتی میں مصروف تھے، کہ اچانک اچھو اور اس کے چار پانچ چیلے ہم پر ٹوٹ پڑے اور زبردستی ہمارا منھ چومنے لگے۔ میرے ہاتھ میں ایک نوکیلی پنسل تھی۔ میں نے غصے میں آ کر زور سے وہی اچھو کے پیٹ میں چبھو دی۔ محانے نے ایک لڑکے کو دانتوں سے کاٹ لیا۔ نتیجتاً انھوں نے ہماری خوب دھلائی کی۔ جب ہم رونے لگے تو ہمیں چھوڑ دیا۔

دوسرے دن میں نے ماسٹر جی سے شکایت کی۔ ماسٹر نے اچھو کو بلایا تو اس نے کہا، ''استاد جی، یہ جھوٹ بولتا ہے، بلکہ اس نے مجھے بازی گر بھی کہا تھا۔ اس پر بھی میں نے اسے کچھ نہیں کہا، چاہے ساری کلاس سے پوچھ لیں۔'' جب کلاس سے پوچھا گیا تو انھوں نے ہمارے خلاف گواہی دے دی۔ لہٰذا ماسٹر نے الٹا ہمیں کو ڈانٹا۔

اس دن سے ہم اور زیادہ سہم گئے اور حیران ہوئے کہ بازی گر کہنے پر یہ آخر کیوں بگڑا! اسے تو فخر کرنا چاہیے تھا۔ پوری کلاس سے ہماری بول چال ختم ہو گئی۔ اچھو کی شہ پر لڑکے ہم پر طرح طرح کے آوازے کستے۔ اس پر غضب یہ کہ استاد نے مجھے بلبل اور محانے کو مینا کا نام دے رکھا تھا۔ لڑکے بھی تقلید میں ہمیں انھی ناموں سے پکارتے۔ ہمارے لیے سال کے وہی دن خوشی کے ہوتے جو ہمارے امتحان کے دن ہوتے کیونکہ امتحان مارچ میں ہوتا جب بہار زوروں پر ہوتی۔ دیہات میں ہر طرف سرسبز کھلیان، پھول، اڑتے ہوئے بھونرے اور چہکتے پرندے دھومیں مچاتے۔ سارا سکول گیندے اور گلاب کے پھولوں سے مہک اٹھتا۔ ہرے ہرے درخت کونپلیں نکالتے اور ہلکی ہوا سے اِدھر اُدھر جھومتے تو دل میں ایک ٹھنڈک اتر جاتی۔ اس وقت ہم سوچتے کہ اب بدلہ لینے کے دن ہیں۔ لہٰذا ۳۱ مارچ کا دن ہم دونوں کی کامیابی کا دن ہوتا۔ رزلٹ بولا جاتا تو ہمیشہ ہم فرسٹ سیکنڈ آتے۔ گیندے اور گلاب کے ہار استاد کے گلے میں پہناتے اور کچھ ہدیہ بھی ضرور دیتے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات پر تھوڑی سی تکلیف بھی ہوتی کہ استاد اچھو اور اس کے چیلوں کو بھی پاس کر دیتا جس کی ہم بالکل توقع نہ کرتے۔

میرا گھر سکول کے ساتھ پڑتا، اس لیے محانا چھٹی کے وقت میرے گھر ہی پناہ لیتا۔ جب تمام لڑکے گزر جاتے تب وہ اپنے گھر جاتا کہ لڑکوں کے شر سے محفوظ رہے۔ اس کا گھر گاؤں کے مرکز میں تھا۔

رفتہ رفتہ اچھو نے پڑھنا بالکل ترک کر دیا لیکن استاد اسے اگلی کلاس میں ترقی دیتے رہے، کیونکہ سالانہ کھیلوں کے ٹورنامنٹ میں وہ سکول کے لیے عزت کا باعث بنتا، اس لیے کہ کبڈی اور فٹ بال میں اس کا دور دور تک ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ کھیل کے میدان میں رہتا اور اساتذہ نے بھی کبھی اسے پڑھنے کو نہیں کہا۔ نہ ہی اس نے خود توجہ دی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ پاس ہو جائے گا۔

آٹھویں کلاس کے بعد اچھو نے اپنے کرتب اور قلابازیوں کا میدان اور وسیع کر لیا۔ اپنے باپ کے ساتھ دوسرے گاؤں میں جا کر میلوں ٹھیلوں میں کرتب دکھانے لگا اور سکول سے اکثر غیر حاضر رہتا، لیکن اساتذہ نے حاضری رجسٹر سے اس کا نام خارج نہ کیا اور نہ ہی غیر حاضری پر کبھی باز پرس کی۔ اساتذہ کی اس پردہ پوشی پر میں اور محانا ضرور کڑھتے کہ آخر استاد اس کو سزا کیوں نہیں دیتے یا پھر اس کا نام کیوں خارج نہیں کرتے۔

جس دن وہ سکول نہ آتا ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ یوں لگتا جیسے آج ہم نے کھل کر سانس لی ہے۔ نویں کلاس میں پہنچے تو اچھو اور زیادہ اپنے کام میں پروفیشنل ہو گیا۔ اب اس نے ہمیں بھی تنگ کرنا کم کر دیا۔ بلکہ اب تو ہمیں اس کے لہجے میں نرمی محسوس ہونے لگی۔ ہفتے میں ایک آدھ دن سکول آتا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لڑکے بھی ہمارے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کرتے گئے۔ نویں کلاس کے آخری دنوں میں تو وہ ہماری عزت بھی کرنے لگا۔ یہ بات اگرچہ ہمارے لیے حیرت کا باعث تھی لیکن ہم نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ البتہ اتنا ہوا کہ ہمارے دل میں اچھو کے خلاف جو کدورت تھی وہ بھی آہستہ آہستہ ڈھل گئی۔ اس سال اس نے سکول کے ٹورنامنٹ میں بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ پہلی دفعہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر میں نے اور مھانے نے بھی اس کی شان میں نعرے لگائے اور تالیاں بجائیں۔ اگلے سال اچھو سکول سے اکثر غائب رہا اور جب دسویں کا بورڈ کی طرف سے امتحان ہوا تو وہ دوسرے کئی لڑکوں کے ساتھ فیل ہو گیا، لیکن ہم دونوں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے اور کالج میں داخلہ لے لیا۔

اچھو نے تعلیم بالکل چھوڑ دی اور مکمل طور پر اپنے آبائی کام کو اپنا لیا۔ اب وہ ڈھول بھی بڑے عمدہ طریقے سے بجا لیتا تھا اور اس نے نوروبازی گر کی جگہ لے لی۔ نورو کا کام بس ہلا شیری کرنا رہ گیا، باقی سب کچھ اچھو نے سنبھال لیا۔

مھانے کے والدین گاؤں چھوڑ کر شہر جا بسے اور مھانا بھی ان کے ساتھ شہر رہنے لگا۔ البتہ کالج میں ہم روزانہ ملتے۔ حتیٰ کہ مھانے نے بی اے کر لیا اور شہر کے ایک سکول میں ٹیچر ہو گیا۔ اس عرصے میں ہم نے اچھو کے متعلق کبھی بات نہ کی اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اب میٹرک کیے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ میں نے ایم اے کر لیا تھا۔ گاؤں میں آتے جاتے اچھو سے ٹاکرا ہوتا تو وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام بھی کرتا۔ میں سلام کا جواب تو دیتا لیکن اس سے زیادہ کھلتا نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ زمانہ بہت آگے نکل گیا۔ اب بچے بازی گروں کے تماشوں کے بجائے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے لطف لینے لگے۔ لوگوں نے بازی گروں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی کیونکہ وہ ہالی وڈ کے بہترین ایکشن دیکھ سکتے تھے۔ اس ماحول میں کوئی اچھو کی قلابازیوں پر کیا دھیان دیتا لہٰذا اب وہ بیاہ شادیوں میں ڈھول بجا کر اپنا وقت بہلانے لگا۔ گاؤں میں سالانہ بازی بھی لگا تا جس سے اس کا سال بھر کا خرچہ نکل آتا۔ یہ بازی تو اب ایک بہانہ رہ گئی تھی۔ روپیہ پیسہ تو لوگ اسے گاؤں کا بازی گر ہونے کی حیثیت سے دیتے تھے۔ ہم نے خود نوروبازی گر کو گندم، کپڑے اور پیسے کئی دفعہ دیے جب وہ لینے آتا۔

میٹرک کے بعد پندرہ سال گزر گئے لیکن مھانے اور اچھو کا کبھی سامنا نہ ہوا۔ نہ اس نے کبھی پوچھا نہ میں نے بتایا۔

مھانے نے اپنی شادی پر کلاس فیلوز میں صرف مجھے بلایا۔ اس کی شادی بھی ایک سکول ٹیچر سے ہوئی اور شہر میں اس نے اپنا ایک خوبصورت گھر بھی بنا لیا۔

اب گاؤں کے اکثر لوگ میرے پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے عزت کرنے لگے۔ میری منگنی بھی ایک پڑھی لکھی اور آفیسر لڑکی سے ہو گئی اور مجھے ایک اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ یوں گاؤں میں میری عزت اور وقار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ملازمت کے ایک سال بعد میری شادی ہوئی تو میں نے سید امان اللہ شاہ کو بطور خاص بلایا۔ شام کے وقت ہم دیگر احباب کے ساتھ بیٹھے مزے سے شادی کی خوشی منا رہے تھے کہ اچھو ڈھول لے کر آ گیا۔ اس نے دھوتی اور کرتا پہنا ہوا تھا اور پاؤں میں ٹائر کا جوتا تھا۔ اچھو نے ڈھول زمین پر رکھ کر پہلے جھومر ڈالی اور پھر اس کے بعد پہلو بدل بدل کر خوب ڈھول بجایا جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ اردگرد کئی بچے بھی جمع ہو گئے۔ میں نے اور سید امان اللہ شاہ نے ٹوپی سوٹ پہنے تھے جو ہمیں خوب جچ رہے تھے۔ اچھو کوئی بیس منٹ بعد اپنا کھیل ختم کر کے آگے بڑھا اور ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ میں نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے کہا، ''دو ہزار سے کم نہیں لوں گا اور ہزار روپے تمھارے بچپن کے دوست شاہ صاحب سے لوں گا۔'' خیر ہم نے اسے پیسے دیے تو وہ بہت خوش خوش چلا گیا۔ اسے جاتے دیکھ کر سید امان اللہ شاہ نے حیرانی سے پوچھا، ''یار علی، اسے کیسے پتہ ہے کہ ہم بچپن کے دوست ہیں؟'' میں نے کہا، ''یہ اچھو بازی گر ہے اور اس نے تجھے پہچان لیا ہے کہ تو مھانا عرف مینا ہے۔'' یہ سن کر امان اللہ حیرت سے اچھو کو جاتے ہوئے تکنے لگا اور پھر اچانک اٹھ کر میرے گلے لگ گیا۔ فرطِ جذبات سے ہمارے آنسو نکل آئے۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ یہ آنسو ہماری بچپن کی یادوں کے تھے یا اچھو بازی گر کے لیے۔

مومن والا کا سفر

گھوڑے کی دُلکی چال سے تانگے میں ایک ردھم پیدا ہوگیا اور وہ دھلکو دھلکو کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ نہر کی پٹڑی پر دونوں طرف کھڑے شیشم اور پیپل کے اونچے اونچے درختوں نے سورج کا راستہ اس طرح روکا کہ دھوپ کی ایک کرن بھی سڑک پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ بعض درختوں کی شاخیں جھک کر نہر میں چلتے پانی کو چھو رہی تھیں اور بارشوں کے باعث ہوا میں ایک سحر زدہ خنکی تھی۔ اگرچہ مومن والا وہی کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، لیکن نذیراں کے برعکس میری اور اختر کی خواہش تھی کہ تانگا شام تک یونہی دھلکو دھلکو چلتا رہے اور ہم جھولے لیتے رہیں۔ درختوں کی بعض شاخیں اور پتے جب ہمارے چہروں سے ٹکراتے تو ٹھنڈک ہمارے سینے کے اندر تک اُتر جاتی۔ ہمیں نہ تو نذیراں کے مقصد سے سروکار تھا اور نہ ہی ان بگلوں کی کوئی پروا تھی جنھیں ہم ٹوکرے میں بند کر کے تانگے پر لادے مومن والا لے کے جا رہے تھے۔ لیکن ٹھہریے، مناسب ہے کہ میں اس کہانی کے پس منظر سے تھوڑا سا آپ کو آگاہ کر دوں۔

ہمارا گاؤں انگریزی منصوبے کے تحت ماڈل ویلج تھا، جس میں ڈاکخانہ، سکول، ہسپتال، یونین کونسل اور اسی طرح کی تمام شہری سہولتیں موجود تھیں۔ خاص ہمارے گھر کے سامنے یونین کونسل کا دفتر تھا، جس میں اونچے اونچے سینکڑوں درخت جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ خدا معلوم کس وقت سارے جہان کے بگلوں نے انھیں اپنا مسکن بنالیا۔ شروع شروع میں تو بگلوں کی آمد بڑی اچھی لگی۔ درختوں پر گویا برف کے سفید گالے جا بجا بکھرے پڑے ہوں۔ جب برسن اور دھان کو پانی لگتا تو یہ ٹولیوں کی ٹولیاں کھیتوں پر ایسے اترتیں جیسے پریوں کے اکھاڑے ہوں، اور رات کے وقت شاخوں پر ذرا سا ہلنے میں عجب طرح کی کھڑکھڑاہٹ ہوتی جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ساز بجاتی چلی جاتی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہمیں معلوم ہوا کہ ان کی ہمسائیگی اتنی بھی خوش کن نہیں جیسی ہم نے خیال کی تھی، بلکہ وہ زحمت ہی زحمت ہے۔ جدھر دیکھو بیٹیں ہی بیٹیں، اور بارشوں میں اس قدر بدبو پھیلتی کہ سانس لینا عذاب ہو جاتا۔ ایک طرف تو یہ وبال، دوسری طرف بال و پر اس قدر بکھرتے کہ آس پڑوس کے کھانے پینے کی اشیا بھی مشکوک ہو جاتیں۔ لہٰذا محلے والوں اور چیئرمین کونسل کے باہمی مشورے سے درختوں کی شاخیں کاٹنے کا فیصلہ ہوا تاکہ بگلے اپنا ٹھکانا بدل لیں۔ لیکن اس عمل میں ایک خرابی یہ تھی کہ بگلوں کے سینکڑوں بچے بارہ مہینے پیدا ہوتے رہتے جو اُڑ نہ سکتے تھے اور ان کی جان کو خطرہ تھا۔ مگر کب تک کوئی ان کے بارے میں سوچتا۔ یوں بھی اس دفعہ مون سون کی بارشوں نے وہ اُدھم مچایا کہ کچی دیواریں اور مکان ایک کر دیے، اور بگلوں کی بدبو اتنی پھیلی کہ الامان۔ بیماریاں پھوٹ پڑنے کا خدشہ ہو گیا۔ لہٰذا درختوں کی چھوٹی بڑی شاخیں کاٹ دیں جس کی وجہ سے تمام بگلے اُڑ گئے۔ گھونسلے بکھرے تو بگلوں کے بچے گر گر پڑے۔ بہت سے تو گرتے ہی مر گئے۔ جدھر دیکھتے، سینکڑوں پرندے بکھرے پڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لاشیں دور تک کچلی ہوئی نظر آتیں۔ کیا سڑکیں اور کیا یونین کونسل کا صحن، ایک مقتل کا نقشہ دکھائی دیتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص گزرتا، انھیں دیکھ کر رو پڑتا، کہ اس سے پہلے گاؤں والوں نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ جو بال و پر نکالے ہوئے تھے وہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے جیسے اپنی جانیں بچانے کے لیے کوئی ٹھکانا ڈھونڈتے ہوں۔

نذیراں کو خبر ہوئی تو بھاگتی ہوئی آئی، ایک بڑا ٹوکرا ہاتھ میں تھا۔ میں اور میرا چچازاد نیکریں پہنے ننگ دھڑنگ کھیل رہے تھے۔ ہمیں حکم ہوا کہ جلدی سے بگلوں کے بچے پکڑ پکڑ کے ٹوکرے میں ڈالو۔ ہمیں تو کھیلنے کو ایک کام مل گیا۔ بھاگ بھاگ کر بگلے پکڑنے لگے، ہماری بلا سے کہ اس کا کیا مقصد ہے۔

اصل میں ہمارا گاؤں اردگرد کے دس پندرہ گاؤں کا مرکز تھا جس کی یونین کونسل کے لیے ایک چیئرمین بذریعہ ووٹنگ منتخب ہوتا۔ اس دفعہ مومن والا کا لال دین منتخب ہوا۔ مومن والا ہمارے گاؤں سے کوئی اڑھائی کلومیٹر دور، نہر کے کنارے واقع تھا۔ نذیراں، جسے تمام گاؤں نے ایسے ہی مفت کی ممبری دی تھی، گاؤں میں کوئی نہ کوئی شغل یا ہنگامہ کھڑا کیے رکھتی۔ ہر پنچایت میں کرسی بچھائے سب سے آگے بیٹھتی۔ کہیں شادی بیاہ ہو، میت اُٹھی ہو یا لڑائی جھگڑا، یہ برابر شریک ہوتی، اور میلے ٹھیلوں سے لے کر ناجائز بچے کی پیدائش تک میں ملوث رہتی۔ جھوٹ بولنے میں ایسی ماہر کہ آپ کسی کا نام لے لیجیے، یہ اس کی سات پشتوں تک اپنی رشتے داری گنوا دے گی۔ کہیں کوئی دعوت ہوتی، یہ بن بلائے جا دھمکتی اور اتنا کھاتی کہ گھر والے ہائے ہائے کہہ اٹھتے۔

لال دین چونکہ نذیراں کی مخالف پارٹی کا تھا، لہٰذا جب دفتر میں آ کر براجمان ہوتا تو اس کی چھاتی پر سانپ پھر جاتا۔ جو اصل ممبر تھے انھیں تو تکلیف ہوتی مگر نذیراں کی 'مدعی سست اور گواہ چست' والی حیثیت تھی، بڑھ چڑھ کر اپنے کو پانچوں سواروں میں رکھتی۔ اب جو درختوں کی شاخیں کاٹی گئیں تو لڑائی کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔

''ہائے، کافر کے بچے نے مخلوقِ خدا پر کیا ستم ڈھایا۔ دیکھو تو کتنا ظلم ہوا! اب تو گاؤں پر عذاب گر کے رہے گا۔ میں کہتی ہوں، یا اللہ! جس طرح اس نے تیری ننھی ننھی جانوں کو مارا، تُو بھی اسے ایسے ہی در بدر کر کے مار۔''

غرض لال دین کو موٹی موٹی گالیاں دیے جاتی اور ہمارے ساتھ مل کے بگلوں کے بچے پکڑ پکڑ کر ٹوکرے میں ڈالتی جاتی۔ جب ٹوکرا بھر گیا تو تانگے والے کو بلا بھیجا۔ اُس وقت ہم کوئی دس برس کے ہوں گے۔ کہنے لگی، ''چلو لڑکو! بگلے لالو کے گھر چھوڑ کے آئیں۔ حرامی جب انھیں پالے گا تو مزہ آ جائے گا۔'' ٹوکرے کے اوپر بڑا سا کپڑا باندھ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر رکھ لیا۔ اگلی سیٹ پر نذیراں پسر گئی اور ہمیں ہودے میں بٹھا لیا۔

تانگا جیسے ہی نہر کے پل پر پہنچا تو نذیراں کی آواز تیز ہو گئی، جو پہلے ہی کافی اونچی تھی۔ یہاں تک کہ لال دین کے گھر کے سامنے تانگا رک گیا۔ ہم دونوں نے تو ایک ہی جھٹکے میں چھلانگ مار دی، جبکہ نذیراں کو اُترنے میں کافی دیر لگی کہ اس کا جسم ایک موٹی تازی بھینس کے برابر تو ضرور ہو گا۔ پھر بڑے آرام سے ٹوکرا کھول کر نیچے رکھا گیا اور لال دین کے دروازے پر دستک دے دی۔

کچھ ہی دیر میں لال دین دھوتی پہنے باہر آیا اور نذیراں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر بڑی گرمجوشی سے آگے بڑھ کر بولا، ''اے نذیراں، تجھے خدا اُٹھائے! آج تو یہاں میرے گھر کیسے پہنچی؟''

نذیراں دایاں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے ایک دم بھڑک کے بولی، ''لال دین، میں نے سوچا کہ آج تیرے ساتھ دو دو ہاتھ کر ہی آؤں۔ درختوں کی شاخیں کاٹتے وقت تجھے موت نہ آئی؟ ہائے اللہ، یہ ظلم تو میری جان کو کھا گیا۔ ہزار جانیں مر گئیں۔ کیا دودھ ایسے سفید فرشتوں کو مار دیا! خدا تیرا بیڑا غرق کرے۔ دیکھ، اب میں تیرے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ خدا کی قسم، تجھے گاؤں میں گھسنے دوں تو شہاب دین کی بیٹی نہیں۔ تو تو بگلے مار کر آرام سے بیٹھا ہے، اُدھر ہمارے گاؤں پر خدا کا قہر نازل ہو گیا۔''

لال دین معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر جلدی سے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے جانے کے چند ثانیوں بعد ایک لڑکا اندر سے رنگین پایوں والی بڑی چارپائی اٹھا لایا۔ چارپائی ڈیوڑھی میں بچھا کر ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ڈیوڑھی کے سامنے سے صاف پانی کی ایک ندی گزرتی تھی جس کے کناروں پر نیم کے بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں میں دور تک بھینسیں بندھی تھیں۔ شاید ان میں سے کچھ بھینسیں لال دین کی بھی ہوں۔ ابھی ہمیں بیٹھے پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ لال دین سفید کرتے اور جامنی رنگ کا لاچا باندھے حقہ لے کر دوبارہ باہر آ گیا۔

اس نے حقہ نذیراں کے آگے رکھ دیا مگر نذیراں کا پارہ سوڈگری سے اوپر تھا۔ مسلسل گالیاں دیتی رہی اور حقے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ لال دین تحمل سے گالیاں سنتا رہا لیکن بجائے غصے ہونے کے ہنستا رہا۔ جب نذیراں گالیاں اور طعنے دیتے دیتے تھک گئی اور خاموش ہوئی تو لال دین آہستہ سے بولا:

''نذیراں، یہ تو میں جانتا ہوں کہ ہماری پوری یونین کونسل میں تیرے جیسا عقلمند کوئی نہیں۔ جتنا کام گاؤں والوں کے لیے تو نے کیا اُس کی کوئی مثال نہیں۔ میں جس قدر تیری عزت کرتا ہوں وہ میرا دل جانتا ہے۔ اب تو جو چاہے سمجھ۔ البتہ درختوں کی شاخیں کاٹنے میں مجھ سے زیادہ تیرے اپنے گاؤں کے لوگوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن پھر بھی تو جو سزا دینا چاہے مجھے قبول ہے۔''

لال دین نے بات کچھ ایسی ملائمت سے کی کہ نذیراں خود بخود نرم پڑ گئی۔ لیکن حقہ گڑگڑاتے ہوئے مسلسل بڑبڑاتی بھی رہی اور لال دین کو بھی کوستی گئی۔ لال دین مسلسل ہنس کے ٹالتا رہا، کہ اتنے میں وہی لڑکا میٹھی لسی کا ایک بڑا جگ لے آیا۔ اول تو نذیراں نے لسی پینے سے انکار کر دیا مگر لال دین کے مسلسل اصرار پر وہیں بیٹھے تین گلاس پی گئی، کہ ایک تو گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت، لسی کچھ زیادہ ہی مزہ دے گئی تھی۔ نذیراں کے بعد کوچوان اور پھر ہم دونوں لسی پر ایسے ٹوٹے کہ مزید دو جگ پی گئے۔

لسی پینے کے بعد دونوں طرف خاموشی چھائی رہی لیکن پھر نذیراں نے سکوت توڑا اور لال دین کی طرف منہ کر کے بولی جبکہ لہجہ پہلے کی نسبت دھیما تھا:

''دیکھ میاں لال دین، بگلوں کے پورے دو سو بچے میں اپنے گھر چھوڑ آئی ہوں۔ اگرچہ گناہ سارے کا سارا تیرا ہی ہے، لیکن پھر بھی ہمارے گاؤں کی بات ہے۔ آخر میں بھی تو گاؤں کی ممبر ہوں۔ سو جو میرا فرض بنتا تھا، میں نے ادا کیا۔ تھوڑے سے بگلے تیرے پاس لے آئی ہوں تاکہ ہم ان کی پرورش کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹوکرے سے کپڑا کھول دیا۔ کپڑا کھلنے کے ساتھ ہی بگلے پھدک پھدک کر باہر نکلنے لگے، جنھیں ہم پھر بھاگ بھاگ کر پکڑ لائے، مگر آدھے کے قریب ٹوکرے کے اندر ہی دم گھٹنے سے مر گئے تھے۔

لال دین نے تمام زندہ بگلے گھر بھجوا دیے اور پھر بڑی مروت سے نذیراں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ نذیراں نے دو تین دفعہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے اصرار کر کے بٹھا لیا اور کہا کہ روٹی کھا کے جانا۔ تھوڑی دیر بعد میں اور میرا چچازاد ندی میں کود پڑے اور پانی میں نہانے لگے جو نیم کی چھاؤں اور خنک ہواؤں کی وجہ سے اور بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لال دین اور نذیراں نہ جانے اس عرصے میں کیا باتیں کرتے رہے، کہ اُن دنوں سیاست، ممبری، عدالت جیسے الفاظ ہماری سمجھ میں نہ آنے والے تھے۔ لہٰذا وہ باتیں کرتے رہے اور ہم نہاتے رہے، جبکہ کوچوان بھینسوں کے آگے پڑی ہوئی گھاس اٹھا اٹھا کر اپنے گھوڑے کو کھلاتا رہا۔ آدھ گھنٹہ اسی طرح گزرا کہ چائے بن کر آ گئی۔ پھر ہم سب مزے سے چائے پینے لگے۔ چائے کے دوران بھی نذیراں اور لال دین باتیں کرتے رہے مگر ہم نے دیکھا کہ اب نذیراں لال دین سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، گویا کبھی کوئی مخالفت تھی ہی نہیں۔ چائے پینے کے بعد کچھ ہی دیر بیٹھے ہوں گے کہ اچانک لال دین نے کہا:

''نذیراں، تو نے میرا گھر تو اندر سے دیکھا ہی نہیں، چل دیکھ تو سہی میری بیوی نے کیا خوبصورت نقش و نگار بنائے ہیں۔ وہ بھی تمھیں ملنا چاہتی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ نذیراں بھی۔

جب نذیراں اور لال دین دوبارہ واپس آئے تو ایک بج چکا تھا۔ میں نے سوچا، کاش نذیراں لال دین کے گھر میں نہانے کے بجائے ہمارے ساتھ اسی ٹھنڈے پانی میں نہا لیتی تو اسے کتنا مزہ آتا۔ اور لال دین کو دیکھو، گھر کے سامنے اتنے ٹھنڈے پانی کی ندی جاری ہے اور یہ احمق نلکے کے گرم پانی سے نہا کے نکلا ہے۔

اب ہم سوچ رہے تھے کہ جانے کب واپسی ہوگی۔ بلکہ کوچوان نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو لال دین نے اسے پھر بٹھا دیا کہ روٹی کھا کے جانا تھوڑی دیر میں ہی تیار ہو جائے گی، جبکہ نذیراں تو اب اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دو ایک چارپائیاں اور بچھ گئیں جس پر گاؤں کے پندرہ بیس لوگ مزید آ بیٹھے۔ اب بھلا نذیراں کی زبان کب رکتی تھی۔ چھوکریوں کے کیریکٹر سے ہوتی ہوئی سیاست اور پھر وہاں سے روم و مصر کے موضوعات لپیٹ دیے۔ بیچ میں ایسے ایسے لطیفے چھوڑے کہ بعض مرد تو شرم سے لال ہو گئے۔ غرض تین بجے تک وہ محفل جمی کہ ''مومن والا'' کے لوگوں نے کہاں دیکھی ہوگی۔ تین بجے وہی لڑکا برآمد ہوا اور کہنے لگا کہ کھانا تیار ہے۔

اب نذیراں کے ساتھ کوچوان اور ہمیں بھی لال دین کا گھر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، جسے دیکھ کر کم از کم مجھے بہت مایوسی ہوئی، کہ اس سے تو اچھا ہمارا اپنا گھر تھا، نہ جانے نذیراں ایک گھنٹہ کیا دیکھتی رہی۔ پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اسے نہانے میں بھی تو وقت لگا ہوگا۔ برآمدے میں دو چارپائیوں کے درمیان ایک میز پر کھانا لگا تھا۔ کھانے میں حلوہ، بھنا ہوا گوشت اور تندور کی روٹیاں تھیں۔ ہم چاروں صبح کے بھوکے تو تھے ہی، سارا کچھ چٹ کر گئے۔ ہمارے کھانے کے دوران لال دین مسلسل حقہ پیتا رہا جبکہ نذیراں ہڑپ ہڑپ کھاتی گئی اور ہمیں کہتی جاتی، ''کھاؤ کھاؤ، آج ہی تو لال دین ہاتھ لگا ہے۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ نذیراں سے پالا پڑا ہے۔'' گوشت اگرچہ اتنا مزے کا نہیں تھا مگر ہم نے برتن خالی کر دیے، اور پھر حلوہ بھی کھا گئے۔

کھانے کے بعد دوبارہ چائے بن گئی، جسے پینے میں ہمیں پہلے سے بھی زیادہ مزہ آیا۔ اس کے بعد نذیراں نے حقے کے دو چار مزید کش لیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب چار بج چکے تھے اور ہم چلنے کے لیے بے چین تھے، باہر نکل کر تانگے پر بیٹھ گئے۔ مگر چلنے سے پہلے لال دین نے پچاس روپے نکال کر کوچوان کو دیے کہ یہ کرایہ میری طرف سے رکھ لو۔ نذیراں کی آنکھوں میں ایک تشکر آمیز چمک پیدا ہوئی۔

تانگا چلنے لگا تو نذیراں نے لال دین کا ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کیا اور کہا، ''لال دین، اب شاید خدا تیرا گناہ معاف کر دے کہ تو نے ہماری بہت خدمت کی۔ اگرچہ تیری بیوی کو گوشت پکانا نہیں آتا کہ اس کا ذائقہ کچھ اچھا نہیں تھا۔''

لال دین گھر میں داخل ہوتے ہوئے رکا اور شرارت آمیز لہجے میں بولا، ''نذیراں، بگلوں کے گوشت کا ذائقہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''
یہ سن کر نذیراں لال دین کو دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو جبکہ ہمیں قے شروع ہو گئیں، اور کوچوان نے جلدی سے تانگا بھگا دیا۔

والٹر کا دوست

کالج میں میرا پہلا دن تھا اور پچاس لڑکوں کی کلاس میں کوئی دوست نہ تھا۔ گاؤں کے سکولوں میں میٹرک کرنے والے لڑکوں میں جو ایک قسم کا احساسِ کمتری پایا جاتا ہے، وہ مجھ میں بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں سب سے آخر میں جا کر بیٹھ گیا۔ اُس دن جتنے اساتذہ نے لیکچر دیے، ایک کی بات بھی میرے پلّے نہ پڑی۔ دوسرا اور تیسرا دن بھی ایسے ہی گزرا۔ گاؤں کی پچھلی پندرہ سولہ سالہ زندگی میں کبھی کبھار ہی شہر میں آیا تھا، لہٰذا اجنبیت ایک فطری عمل تھا۔ کچھ لڑکے میری طرف تنکھیوں سے دیکھتے تو میں شرما سا جاتا اور شہری لڑکوں کی خود اعتمادی پر رشک کرتا جو مجھ میں بہر حال نہ تھی۔ چوتھے دن جونہی کلاس میں داخل ہوا، سامنے کے ڈیسک پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے دن سے ہی وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید میں اُس کی دعوت نظر انداز کر جاتا لیکن مجھے اس میں ایک کشش محسوس ہوئی۔ سیاہ آنکھوں، چمکتے بالوں اور گول مول سرخ و سفید چہرے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کتابیں رکھ کر اُس سے ہاتھ ملایا تو مجھے انتہائی نرماہٹ اور فرحت کا احساس ہوا۔ بیٹھنے کے چند ثانیوں بعد ہی اس نے سرگوشی سے کہا، ''میرے دوست بنو گے''؟ میں نے جلدی سے ''ہاں'' میں سر ہلا دیا۔

پھر اگلے چند دنوں میں ہماری دوستی مثالی کہلانے لگی۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنے پہلے تمام دوستوں اور سکول فیلوز کو نظر انداز کر دیا۔ ہمارے پانچوں پیریڈ اکٹھے تھے۔ عمر کا باپ کشمیری تھا جس کا شہر میں ایک بڑا قالینوں کا کارخانہ تھا۔ اس نے عمر کو ایک موٹر سائیکل لے دی تھی۔ وہ روزانہ صبح مجھے بسوں کے اڈے سے پک کر لیتا اور کالج سے چھٹی کے بعد وہیں بس پر بٹھا کر اپنے گھر جاتا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ باتیں کرتے کرتے گاؤں تک چھوڑ گیا۔ پھر اکثر دوپہر کا کھانا اُن کے گھر ہی کھانے لگے۔ کئی دوسرے لڑکوں نے ہمارا دوست بننے کی کوشش بھی کی مگر ہم اُن کے ساتھ ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔ کینٹین، لائبریری، کمپنی باغ، اور شہر میں بیٹھنے کی جتنی جگہیں تھیں، ہم دونوں نے کھوج ڈالیں۔ گھنٹوں Statistics اور دوسرے مضامین پر مل کر کام کرتے، حتیٰ کہ کالج وقت کے بعد ٹیوشن بھی ایک ہی ٹیچر کے پاس رکھے۔ الغرض اس ایک سال کے عرصے میں ہمارا تعلق اس قدر بن گیا کہ گاؤں سے شہر کا فاصلہ اگرچہ آٹھ کلومیٹر تھا لیکن گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی ایک دوسرے کو ملنے روز آتے جاتے رہے۔

علاوہ اس کے عمر نے میری طبیعت میں ایک اور طرح سے بھی دخل دیا کہ میں تھوڑے ہی عرصے میں جینز پہننے لگا۔ قدو قامت، رنگ اور نین نقش میں شاید ہی کوئی لڑکا کالج میں ہوگا جو میرے مقابلے میں آتا ہو، اس لیے کہ گاؤں کی صاف آب و ہوا اور دودھ مکھن بچپن ہی سے میری خوراک کا حصہ تھے، لہٰذا میرے اندر بھی ایک قسم کا غرورِ حسن پیدا ہو گیا اور میں چال ڈھال میں ایک شعوری نازنخرہ دکھانے لگا۔ بہر حال کالج کے پہلے سال نے مجھے بالکل بدل کر رکھ دیا اور عمر کی صحبت میں ایک قسم کا احساسِ برتری بھی پیدا ہو گیا کہ عام لڑکوں سے ہم دونوں شکل و صورت، ذہانت اور روپے پیسے میں برتر تھے، کیونکہ اُن دنوں میرے ابا بھی کویت میں تھے۔

اگلے برس ہم دونوں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو کر سیکنڈ ایئر کے پیریڈ لینے لگے اور فرسٹ ایئر میں نئے لڑکے آ گئے۔ نئے آنے والوں میں ایک انگریز لڑکا بھی تھا، جو کالج میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ سنہری بال، نیلی آنکھیں، پتلا اور نکلتا ہوا قد سب کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ہی مغرور تھا، کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔ بدتمیزی کی حد تک خود اعتمادی اور بے نیازی کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ اساتذہ کے ساتھ بھی ایسے ہاتھ ملاتا گویا ان پر احسان کر رہا ہو۔ اس کے کالج میں آنے کے بعد ہماری انانیت کو کچھ ٹھیس ضرور پہنچی، لیکن دو ہی ماہ بعد اچانک ایک خوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ والٹر نے کالج ٹائم کے بعد اُسی ٹیچر کے پاس Statistics کی ٹیوشن رکھ لی جس سے ہم پڑھ رہے تھے۔ چونکہ وقت بھی ایک ہی تھا، اس لیے چند ہی دنوں میں وہ ہمارا دوست بن گیا۔ پھر جلد ہی مزاج بھی مل گیا۔ کالج میں بھی وہ ہمارے ہی ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اس طرح ہماری دوستی ٹرائی اینگل کی شکل اختیار کر گئی۔ والٹر اردو اور انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ شہر کے ساتھ اس کے والد کی دو ہزار ایکڑ زمین تھی۔ تقسیم کے وقت والٹر کے اجداد نے یہ زمین پاکستان کی حکومت سے خرید کر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور برطانیہ واپس نہ گئے۔ لیکن یہاں کے کالے عیسائیوں سے اُن کی کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ شادی بیاہ کے سلسلے برطانیہ ہی میں تھے۔ وہ جب چاہتے، لندن چلے جاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ والٹر برطانیہ میں رہنا ناپسند کرتا تھا۔ میرے پوچھنے پر ایک دن اُس نے بتایا کہ یہاں کے لوگ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ مجھ میں ایک قسم کا احساسِ برتری موجود رہتا ہے۔ بڑے سے بڑا آدمی جھک کر اور ادب سے پیش آتا ہے۔ ایک دفعہ میں ڈیڈی کے ساتھ ایک بڑے سرکاری افسر کے گھر دعوت پر گیا تو اُس نے اپنی بیٹی کو میرے استقبال کے لئے دروازے پر بھیجا جس نے اپنے ہاتھ سے مجھے ڈرنک بھی کرائی۔ جب میں سرور میں آ کر بیڈ پر گرا تو اُس نے میرے جوتوں کے تسمے بھی کھولے۔

''لیکن جو رومانس کا لطف انگلینڈ میں ہے وہ تو یہاں نہیں۔ ایک سے ایک لڑکی کھلے عام وہاں ملتی ہے،'' میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"Brother, you don't know about it." والٹر تفاخرانہ لہجے میں بولا۔ ''کہو تو بڑے بڑے رئیس خانوں کی لڑکیاں کھنچی چلی آئیں اور پھر جو عاجزی اور جوانی وجذبہ ان میں ہے وہ لندن کی متکبر حسینوں میں کہاں؟ ویسے بھی مجھے ہندوستانی سفید رنگ پسند ہے۔ I like them. I want to live like a prince and Pakistan is a suitable place for this. جبکہ برطانوی مجھے امتیازی مقام نہیں دیتے۔ وہاں تو احمقوں نے نوکر اور آقا کی تمیز بھی ختم کر دی ہے۔ کسی کو ڈانٹو تو حرامی قانون کی دھمکیاں دینے لگتا ہے۔ ڈیئر علی، یہاں حکم چلانے میں جو لطف ہے وہ لندن میں کہاں ''؟

''لیکن وہاں تعلیم تو اچھی ہے،'' میں نے ایک اور دلیل پیش کی۔

''مجھے اچھی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ویسے اچھی تعلیم تو لاہور میں بھی ہے،'' وہ بولنے لگا۔ ''لیکن مجھے یہی شہر پسند ہے۔ چلتی نہروں، لہلہاتی فصلوں، بھرے باغات اور نوکروں کی فوج میں ہی میرا دل لگتا ہے۔ مجھے نوابی کلچر

پسند ہے۔کالج میں تو صرف دل بہلانے آتا ہوں۔دراصل میں نواب بننا پسند کرتا ہوں۔I am a Nawab, Walter is Nawab. اوالٹر ایک دم لہر میں آ گیا۔اور ہم اُس کی اس سرشاری کی حالت سے لطف لینے لگے۔اس سب کے باوجود ہم نے دیکھا کہ ہمیشہ گرمیوں میں وہ لندن چلا جاتا۔مئی سے اگست تک کے دن وہیں گزارتا۔یہ سب کچھ تو تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ والٹر نے ایک انگریز ہوتے ہوئے بھی کوئی کتا نہیں پالا تھا حالانکہ اس کے باپ کے پاس عمدہ نسل کے کئی کتے تھے۔

والٹر کبھی کبھار چرچ بھی چلا جاتا۔دو تین دفعہ مجھے اور عمر کو بھی ساتھ لے گیا۔اب کالج میں میرا اور عمر کا وقار مزید بلند ہو گیا تھا۔کالج کے باہر اکثر اوقات لوگوں کی مرعوبیت اس قدر بڑھ جاتی کہ راہ چلتے ہمیں دور ہی سے سلام کرتے اور بعض آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے گھٹنوں تک جھک جاتے۔بلکہ اب تو کہیں میں اور عمر اکیلے بھی ہوتے تو شہر کے کئی آدمی ہمیں رشک سے دیکھتے ہوئے سلام کر دیتے۔ویسے بھی ہمارے اور والٹر کے رنگ میں انیس بیس کا ہی فرق تھا۔کالج میں والٹر کا ایک اور دوست یوسف مسیح بھی تھا جو اتنا کالا تھا کہ افریقی بھی اُس پر رشک کریں۔والٹر اُسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔وہ شہر کے چرچ سکول میں اُس کے ساتھ ہی پڑھا تھا اور شہر کے ساتھ ہی کے دیہات کا غریب عیسائی تھا۔شاید والٹر اُس کی مالی مدد بھی کرتا ہو۔والٹر کی کتابیں ہمیشہ وہی اُٹھاتا،ضرورت کی کوئی چیز منگوانا ہوتی تو بھی وہی لا کر دیتا۔

والٹر کا گھر فروٹ فارم کے درمیان نہر کے کنارے انتہائی وسیع رقبے پر تعمیر ہوا تھا اور بڑے بڑے سایہ دار درختوں سے گھرا تھا۔برگد،پیپل اور آم کے درختوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی کئی نہریں بہتی تھیں جو دور تک پھیلے ہوئے باغوں کو پانی سے سیراب کرتیں۔گھر کے صحن میں رنگ برنگے پھولوں کے بڑے بڑے تختے بچھے تھے جن پر چھوٹے چھوٹے پرندے چہکتے اور تتلیاں رقص کرتی رہتیں۔کوٹھی مغلیہ اور انگریزی فنِ تعمیر کا امتزاج تھی۔

اُس نے کبھی ہمارے ساتھ عیسائیت پر بات نہیں کی اور نہ ہی ہم نے اُسے مسلمان کرنے کی کوشش کی،کیونکہ ایک تو ادھر اُدھر کی خوش گپیوں ہی سے فرصت نہ تھی،دوئم عملی طور پر ہم دونوں میں بھی مسلمانوں والی کوئی بات نہ تھی،بلکہ ہمارا پورا گیٹ اپ Playboy کا تھا۔البتہ یوسف مسیح جب حضرت عیسیٰ کا تذکرہ کرتا تو ہم بڑے مودب ہو جاتے۔وہ ہمیں اکثر حضرت عیسیٰ کی انسان دوستی اور مساوات کے واقعات سناتا جنھیں والٹر ایک قسم کی بے توجہی سے سنتا،مگر جناب عیسیٰ کے نام پر اپنے سینے پر ہاتھ کے اشارے سے صلیب ضرور بناتا۔شروع شروع میں ہم والٹر کے ساتھ گپ تو لگاتے رہے لیکن اکٹھے چائے وغیرہ پینے کا کبھی موقع نہ ملا۔

ایک دن ہم لائبریری کی طرف جا رہے تھے۔مئی کا مہینہ تھا اور سخت گرمی تھی۔میں نے کالج کے الیکٹرک کولر سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی مگر والٹر نے مجھے اشارے سے روکا اور اپنی گاڑی کی چابی یوسف مسیح کو تھماتے ہوئے کہا کہ وہ جلدی سے کار میں پڑے کولر سے منرل واٹر کی بوتل نکال لائے۔یوسف نے بغیر کسی تاخیر کے بوتل لا کر والٹر کے حوالے کر دی۔والٹر نے ڈسپوزیبل گلاس بوتل سے الگ کیا اور اُس میں پانی ڈالنے لگا۔اُس کے اس عمل کے دوران میں نے دل میں خیال کیا، والٹر کہیں پانی پہلے پی کر گلاس جوٹھا نہ کر دے۔اگر ایسا ہوا تو بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے،یعنی اُس کے بعد جو ٹھے گلاس میں پانی نہ پییں گے تو والٹر دوستی سے بدگمان ہو جائے گا،اور اگر پئیں گے تو آخر کو ہم مسلمان ہیں،اور یہ چاہے جتنا بھی خوبصورت ہو،مگر ہے تو عیسائی۔ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے پانی کا گلاس مجھے تھما دیا،جس کی وجہ سے فوراً میری پریشانی دُور ہو گئی،میں نے وہ گلاس عمر کی طرف کر دیا۔دوسرا گلاس پھر اُس نے مجھے دے دیا جو میں پی گیا۔تیسری دفعہ اُس نے گلاس بھر کر خود پی لیا۔اس دوران پانی کی بوتل ختم ہو چکی تھی،لہٰذا یوسف کو پانی الیکٹرک کولر ہی سے پینا پڑا۔ خیر،اُس دن ہم نے شکر کیا کہ ہمارا ایمان بھی بچ گیا اور دوستی بھی قائم رہی۔

بہر حال،یہ دوستی کے ابتدائی دنوں کی باتیں تھیں۔بعد میں آہستہ آہستہ جب ہم مل کر کینٹین جانے لگے اور خوب گھل مل گئے تو ہمیں اپنے ایمان کی کوئی زیادہ فکر نہ رہی۔پھر تو جان بوجھ کر ایک دوسرے کا جوٹھا کھانے پینے لگے۔بہت سے کالج کے لڑکے ہمیں طعنہ زنی بھی کرتے کہ عیسائی کے ساتھ مل کر کھاتے پیتے ہیں،لیکن ہم نے اُن کی کوئی پروا نہ کی؛ ہم جانتے تھے یہ حسد کرتے ہیں۔اگر کبھی انھیں موقع ملے یا والٹر انھیں منھ لگائے تو یہ کبھی پیچھے نہ ہٹیں۔

کالج میں اسٹوڈنٹس کی بہت سی سیاسی تنظیمیں تھیں لیکن ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔شروع شروع میں اکثر تنظیمی لڑکوں نے ہم پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر والٹر کی طاقت کے آگے ہتھیار ڈال دیے جو اُسے اپنے معاشی اور نسلی پس منظر سے حاصل تھی۔اس کے باوجود ایک تنظیم کے چند ملا قسم کے لڑکے کسی بھی طرح سرنڈر ہونے میں نہیں آتے تھے۔وہ آئے دن دق کرنے لگے۔کبھی اسٹرائیک کرتے کہ کالج سے غیر مسلموں کو نکالا جائے،کبھی عمر اور مجھ پر دباؤ ڈالتے کہ والٹر کی دوستی سے الگ ہو جائیں۔جب ہم کسی بھی طرح سے باز نہ آئے تو انھوں نے کینٹین میں ہمارا داخلہ منع کر دیا کہ ہم کینٹین کے برتن ناپاک کر دیتے ہیں۔ایک دن جب ہم کینٹین میں چائے پینے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے،اُسی مذہبی تنظیم کے سربراہ نے پچاس لڑکوں کے ہمراہ کینٹین کا گھیراؤ کر لیا،ہمیں ننگیں توڑنے کی دھمکی دی اور دھکے دے کر کینٹین سے باہر نکال دیا۔علاوہ ازیں،ہمیں زدوکوب بھی کیا بلکہ سب سے بڑا ظلم تو انھوں نے یہ کیا کہ یوسف بیچارے کے کاندھوں پر ''پلید کتا'' کا اسٹکر چپکا دیا۔اُس دن ہمیں شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔والٹر تو آگ کی طرح تپنے لگا۔بڑی درشتی سے خدا جانے انگریزی میں کیا کیا بولتا گیا۔میں اُس ملاگڑ کے سے اُلجھنے لگا تو عمر نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

مگر والٹر کسی طرح بھی اعتدال پر نہیں آ رہا تھا۔کہنے لگا،''کینٹین میں اگر چائے پییں گے تو ابھی!اس حرامزادے ملّا نے سمجھا کیا ہے۔''

فوراً ہم تینوں کو کار میں بٹھا کر ڈی سی آفس کی راہ لی اور بغیر اجازت کے اندر گھستا چلا گیا۔اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے ہی عمر کمرے میں داخل ہو گیا۔ڈی سی صاحب دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔پھر بڑے تحمل سے ہم تینوں کو بیٹھنے کا کہا۔والٹر پانچ منٹ تک ڈی سی کے ساتھ مسلسل بولتا رہا۔کہنے لگا،''فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہو گا۔''پھر کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر کہنے لگا:

Where is Yousaf? وہ ہمارے ساتھ تھا۔

ڈی سی صاحب نے گھنٹی دے کر پی اے کو بلایا اور اُسے کہا کہ باہر کوئی یوسف لڑکا ہے؟ پی اے نے نہایت مودب ہو کر کہا،''سر،باہر ایک عیسائی لڑکا یوسف مسیح موجود ہے،اُسے ہم نے باہر روک کر ویٹنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔''

''او کے۔اُسے بٹھاؤ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ سے میری بات کراؤ۔''

دو گھنٹے بعد کالج کی اسلامی تنظیم کے سربراہ سمیت چھ لڑکے ہمارے سامنے ڈی سی صاحب کے کمرے میں مجرموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔انسپکٹر نے انھیں آگے دھکیلتے ہوئے فخریہ مسکرا کر کہا،''سر،انھیں

ڈرائنگ روم کی سیر کروا کے آپ کے پاس لائے ہیں،'' اور لیڈر کے بالوں کو کھینچتے ہوئے بولا ''سر، یہ نواب کا بیٹا مجھے بڑی دھمکیاں دیتا تھا۔''

تمام لڑکوں کے بل نکل چکے تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ لیڈر کی آنکھوں میں ابھی تک مجرمانہ بے باکی موجود تھی۔ دو تین منٹ بعد ایس پی صاحب بھی وہیں آ گئے اور ڈی سی آفس میں عدالت لگ گئی۔

اب یوسف کو بھی اندر بلا لیا گیا جو پچھلے اڑھائی گھنٹوں سے ویٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا جس کی مرہم پٹی کے بارے میں شاید ابھی تک کسی کو بھی خیال نہیں آیا تھا۔ ایک پانی کی بڑی بوتل اور گلاس بھی میز پر رکھ لیا اور اس کے بعد ایس پی صاحب نے یوسف مسیح سے کہا کہ اپنے ہاتھ سے اس گلاس میں پانی ڈالو اور دو گھونٹ خود پی کر اس مولانا کے بچے کو دو۔ ساتھ ہی اُن سے کہا، ''اگر کسی نے ذرا بھی سرتابی کی کوشش کی تو دوبارہ ڈرائنگ روم میں لے جایا جائے گا۔''

یوسف مسیح باری باری اپنے منہ سے پانی جوٹھا کر کے ایک ایک لڑکے کو دیتا رہا اور وہ پیتے رہے۔ لیڈر کو دو دفعہ جوٹھا پانی کر کے پلایا۔ اس کے بعد پولیس ان سب کو لے کر چل دی۔ اس سارے عمل میں والٹر، میں اور عمر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ محظوظ ہوتے رہے۔ کارروائی ختم ہونے پر والٹر نے یوسف کو ایک تھپکی دی۔ جواباً یوسف بھی تحسین حاصل کر کے مسکرا دیا۔ دوسری طرف پہلے ڈی سی صاحب اور پھر ایس پی صاحب نے ٹیلی فون پر والٹر کے والد مسٹر جون گیپ والٹر کو ساری واردات ہنس ہنس کر سنائی۔

اُس دن کے بعد والٹر ہمیں اپنی کار میں سیر پر بھی لے جانے لگا۔ کبھی دریا پر اور کبھی کسی میلے میں۔ بعض دفعہ ہمارے گرد بھی ایک مجمع سا لگ جاتا اور لڑکے بالے ہمیں کوئی آسمانی مخلوق خیال کرتے، جس کی وجہ سے ایک انجانے تکبر کی گرانی ہمارے سر میں آ گئی۔ یوسف مسیح بھی ہمارے ساتھ ہوتا، خاص کر جب ہم شکار کے لئے نکلتے۔

والٹر کے گھر جانا اب ہمارا معمول بن چکا تھا جہاں نوکروں کی ریل پیل تھی۔ وہ والٹر کی وجہ سے ہماری بھی عزت کرتے۔ گاہے گاہے ان پر ہم بھی حکم چلا کر لطف اندوز ہوتے۔ اکثر پاپلر اور برگد کے گھنے سایوں میں بیٹھ کر شطرنج کھیلتے۔ ان اوقات میں یوسف ہمارے پاس بیٹھا فقط دیکھتا رہتا۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی والٹر نے اسے کھیلنے کی دعوت دی ہو۔ شاید یوسف کو شطرنج کھیلنا ہی نہ آتی تھی۔

جون آیا تو کالج میں تین ماہ کی چھٹیاں ہو گئیں۔ والٹر نے ہمیں بتایا کہ وہ یہ تین ماہ لندن گزارے گا۔ یہ سن کر میں اور عمر کچھ اداس ہو گئے۔

تعطیلات میں ابھی آٹھ دس دن باقی تھے کہ والٹر نے مجھے اور عمر کو اپنے گھر میں کھانے پر بلایا۔ ہم پہنچے تو والٹر ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں یوسف مسیح آج پہلے سے موجود تھا۔ میں نے خیال کیا، شاید آج ہمارے ساتھ یوسف بھی کھانے میں شریک ہوگا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ کوفت سی ہوئی۔ دوسری طرف یوسف آج بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ غالباً اسے اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا کہ وہ اتنے خوبصورت دوستوں کے ساتھ رہتا ہے جو اُسے اپنے ہی جیسا سمجھتے ہیں اور کوئی تفریق نہیں کرتے۔ ہم نے والٹر کو کبھی کوئی حرام چیز کھاتے پیتے نہیں دیکھا، سوائے بیئر کے۔ جب کبھی سیر کو نکلتے تو وہ ہمارے لیے کوک، اپنے اور یوسف کے لیے بیئر کی بوتلیں رکھ لیتا۔ یوسف بیئر بہت خوش ہو کر پیتا تھا اور کبھی کبھی ہمارے مذہب میں بھی اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیتا، مگر والٹر نے ہم سے کبھی بھی اصرار نہ کیا تھا۔

آج سب سے پہلے ہماری کوک سے تواضع کی گئی۔ حسبِ معمول والٹر نے اپنے اور یوسف کے لیے بیئر ہی لا کر رکھی۔ نہایت آرام دہ ایر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے دو گھنٹے تک ہم گپیں ہانکتے رہے۔ اس کے بعد نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ والٹر ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ کھانا الگ الگ دو میزوں پر لگا ہوا تھا۔

ایک میز کے گرد تین کرسیاں اکٹھی تھیں جب کہ دوسری میز کے ساتھ صرف ایک کرسی تھی، مگر کھانا دونوں میزوں پر ایک ہی جیسا تھا۔ والٹر نے بڑے پیار سے یوسف مسیح کو ایک کرسی والی میز پر بٹھا دیا اور خود میرے اور عمر کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔

واپسی پر عمر مجھ سے کہنے لگا، ''دیکھو یار علی، انگریز ہر معاملے میں مساوات کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے اور یوسف کے کھانے میں اس نے کوئی فرق نہیں رکھا۔''

میں نے عمر کی تائید میں سر ہلانے کے ساتھ دل میں کہا، ''حالانکہ ہماری میز کے گرد ایک کرسی کی مزید جگہ تھی۔''

شیدے نے پگڑی باندھ لی

مجھے فیصلے پر اعتراض نہیں تھا لیکن یہ بات نہ جانے کیوں میری سمجھ میں نہ آئی کہ جہاں بھی جرم ہوتا یہ دونوں موقعے پر سب سے پہلے کیسے پہنچ جاتے۔ گاؤں میں ڈاکو آ گھستا تو یہ پیچھا کرتے۔ چوری ہو جاتی تو کھوجی کے ساتھ سارا سارا دن یہ خوار ہوتے۔ ایسا کئی دفعہ ہوا کہ گاؤں والوں کے برے بھلے میں کام آئے۔ لوگ تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے، مگر جانے کیوں میں ان سے حسد کرتا۔ یہ جب بھی کوئی اچھا کام کرتے میں جل اٹھتا۔ شاید اس لیے کہ وہ میری بالکل عزت نہیں کرتے تھے۔ یا پھر میں شکی مزاج تھا کہ ہر بات میں کیڑے نکالتا۔

بہر حال گاؤں کے معززین اور سکول کے اساتذہ نے باہمی اتفاق سے فیصلے پر دستخط کر دیے، کیونکہ یہ گاؤں کی عزت کا معاملہ تھا۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے گاؤں کی لڑکی کے ساتھ دوسرے گاؤں کا کوئی لڑکا عشق لڑائے۔ اس لیے اب وسیم کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ یہاں پر اپنی تعلیم جاری رکھ سکے، بلکہ وہ شکر کرے کہ اسے صرف مار پیٹ کر فارغ کر دیا گیا۔ گاؤں کے تمام لوگوں نے اس فیصلے کو آفرین کہا اور شیدے کو شاباش دی جس نے اپنے دوست فیکے گجر کے ساتھ مل کر رانو اور لونڈے وسیم کو گنے کے کھیت میں جا دبوچا اور پکڑ کے پنچایت کے آگے کر دیا تھا۔

سکول سے فارغ کرنے کے علاوہ وسیم کے والدین کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ آئندہ اسے اس گاؤں کے حدود میں دیکھا گیا تو ذمے دار وہ خود ہوں گے۔

باوجود اس کے کہ مجھے وسیم سے کوئی ہمدردی نہ تھی، پہلے کی طرح آج بھی ان کا یہ معرکہ اچھا نہ لگا۔ یہی حالت علوی کی تھی۔ علوی کا گھر بالکل میرے سامنے تھا۔ کوئی تیس کے پیٹے میں ہوگا۔ تعلیم اچھی خاصی تھی۔ عورت کی جنسیت پر بولنے کا اتنا چسکا کہ شاید کسی میں ہو۔ اس معاملے میں اس کی ہمدردیاں وسیم اور رانو کے ساتھ تھیں۔ شیدا اور فیکا گجر قابلِ نفرین تھے جنھوں نے بیچ کھیت کھنڈت ڈال دی۔

بہر حال کچھ دنوں میں یہ قضیہ آیا گیا ہوا اور معاملات معمول پر آ گئے۔

ہائی سکول ہمارے گھر سے سو قدم کی راہ پر تھا اور سکول کی عمارت گاؤں کی آخری نکڑ پر تھی، جس کے آگے کھیت کھلیان شروع ہو جاتے۔ شام ڈھلے گاؤں کے مضافات کی فضا انتہائی رومانوی ہو جاتی۔ پرندے اندھیرا چھا جانے سے پہلے اپنے گھروں کو جانے لگتے۔ جب وہ سکول کے میدان کے اوپر سے قطار اندر قطار اڑتے اور افق میں آہستہ آہستہ گم ہو جاتے تو انھیں دیکھنے میں بہت مزہ آتا۔ میں اور علوی روزانہ یہ نظارہ کرنے کے لیے سکول کے گیٹ کے آگے آ کر کھڑے ہو جاتے اور گھنٹوں کھڑے اِدھر اُدھر کی مارتے رہتے، یہاں تک کہ عشا کی اذانیں بھی وہیں پر سنائی دیتیں اور ہمارا یہ عمل اتنا متواتر ہو گیا کہ اگر کسی دن وہاں کھڑے نہ ہو سکتے تو یوں محسوس ہوتا گویا اہم فرض قضا ہو گیا۔

گاؤں کی اکثر عورتیں جن کے گھروں میں رفع حاجت کا انتظام نہ تھا شام کے جھٹ پٹے میں ٹولیوں کی شکل میں کھلیانوں کا رخ کرتیں۔ رانو واقعے کے بعد غالباً ایک ماہ کسی کو نظر نہ آئی، حتیٰ کہ رفع حاجت کے لیے بھی باہر آتی جاتی ہم نے نہ دیکھی۔ پھر رفتہ رفتہ دیگر عورتوں کے ساتھ دیکھی جانے لگی۔ قریباً دو ماہ بعد تو یوں چلنے پھرنے لگی گویا کوئی واقعہ ہی نہ ہوا تھا۔

اس کا گھر ہماری گلی سے دوسری والی گلی میں تھا۔ شیدے اور فیکے کا گھر بھی اسی گلی میں تھا۔ بلکہ فیکا تو عین اس کے سامنے والے گھر میں رہتا تھا۔ اس کی بیٹھک کے آگے نیم کا سایہ دار پیڑ تھا جس کے نیچے چارپائی پڑی رہتی۔ اب شیدے اور فیکے کا اکثر وقت اسی چارپائی پر گزرتا اور خوب قہقہے اڑتے۔ دن گزرنے کے ساتھ قہقہے فقرے بازی میں بدل گئے اور گاؤں کے لوگوں میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ بات اب پڑوسیوں سے نکل کر دیگر لوگوں میں بھی چلی گئی لیکن سامنے آ کر کوئی نہ ٹوکتا کہ دونوں جوان گاؤں کے چودھریوں میں سے تھے۔

ادھر رانو غضب کی خوبصورت تھی اور گھر میں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ایک بوڑھا باپ جو سارا دن بکریاں چراتا، شام تھکا ہارا سو جاتا، ماں کو مرے آٹھ سال ہوئے۔ چنانچہ کہاں تک بچتی، چند دنوں میں راہ پر آ گئی اور خفیہ اشارے ہونے لگے۔ پھر اشارے کھل کھیلنے میں تبدیل ہو گئے۔ مگر گاؤں میں ایسا کوئی بھونچال نہ آیا جس سے وہ محتاط رویہ اختیار کرتے۔ بلکہ رانو اب دونوں کے ساتھ بیچ بازار میں گپ مارتی اور کھلکھلا کر ہنستی۔ ایک دفعہ تو میں نے خود اسے شیدے سے بات کرتے دیکھا۔ بہت غصہ آیا اور میرا جی چاہا کہ اس کے خنجر گھونپ دوں۔ سارے گاؤں سے آنکھ لڑاتی مگر ان سے دور رہتی۔ جب میں نے یہ بات علوی کو بتائی تو اس نے بھی بے حیا کو بہت کوسا۔ کہنے لگا، ''دیکھ بھائی، عورت حیا میں رہے تو رہے، ورنہ یوں عقل سے جاتی ہے۔'' خیر اس کے بعد ہم نے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا۔ شاید ہمارے پاس گفتگو کو اور بہت سے موضوع تھے، یا ویسے ہی وہ ہمارے خیال میں نہ آئی، حتیٰ کہ مہینے گزر گئے۔

ایک دن ہم سکول کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے اور معمول کے مطابق ہمیں کھڑے کھڑے رات دس بج گئے۔ گاؤں میں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب پچانوے فیصد دیہاتی سوئے ہوتے ہیں۔ اچانک ہمارے پاس سے تین آدمی گزرے جن میں دو کو ہم نے بخوبی پہچان لیا۔ ایک شیدا اور دوسرا فیکا تھا۔ لیکن تیسرا آدمی جس کے سر پر پگڑی بندھی تھی اور ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ قد دونوں سے چھوٹا تھا۔ باوجود یکہ چاندنی رات تھی لیکن ہماری پہچان میں نہ آیا۔ میں تو نظر انداز کر دیتا لیکن علوی کی متجسس آنکھیں بھانپ گئیں کہ ہو نہ ہو پگڑی والا مشکوک ہے۔ کہنے لگا، ''آؤ ان کا پیچھا کریں۔'' اس وقت میری طبیعت بھی مہم جوئی پر آمادہ تھی، ہم نے انتہائی احتیاط سے ان کا پیچھا شروع کر دیا۔ انھیں محتاط فاصلے پر رکھتے فصلوں اور درختوں کی اوٹ سے تعاقب کرتے رہے۔ ہمیں ان کی باتیں سنائی نہ دیتی تھیں لیکن مبہم آوازیں ضرور آتیں جنھیں ہم نہ سمجھ سکتے تھے۔

اب ہم گاؤں سے قریب قریب دو کلومیٹر باہر آ گئے تھے اور سخت حیران تھے کہ گاؤں سے اتنا باہر آ جانے کے بعد بھی وہ کوئی عملی کارروائی نہیں کرتے بلکہ آگے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہم اکتا کر مڑنے ہی والے تھے کہ شیدا اور فیکا رک گئے اور نالے کی پگڈنڈی پر بیٹھ گئے جبکہ پگڑی والا کھڑا رہا۔ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے جنھیں دور ہونے کی بنا پر ہم نہ سن سکے۔ پھر شیدے یا شاید فیکے نے اس کا بازو پکڑ

کے کھینچا، جس پر اس نے مزاحمت کی اور اس کی پگڑی کھل گئی۔ ہمارا شک یقین میں بدل گیا۔ لمبے بال اور روشن چہرہ نظر آ رہا تھا۔ جب دونوں نے زبردستی پکڑنے کی کوشش کی تو رانو نے چیخ ماری جس پر گھبرا کر دونوں نے چھوڑ دیا۔ پگڑی دوبارہ باندھ دی گئی اور پھر تینوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اب ہماری حیرانی دو چند ہو گئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اگر آمادہ نہیں تو گھر سے ساتھ آئی ہی کیوں؟ مگر زیادہ تر ہمیں اپنی اشتیاق انگیز نگاہوں کی ناکامی پر افسوس تھا جو ابھی تک کچھ نہ دیکھ سکیں۔ خیر، تجسس ہمیں ان کا پیچھا کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسرے گاؤں کی حدود میں داخل ہو گئے۔ جب پڑوسی گاؤں قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تو تینوں پھر رک گئے۔ میں اور علوی ایک جھاڑی کی اوٹ لے کر ان سے کوئی تیس قدم پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر رکنے کے بعد رانو اور شیدا تو وہیں بیٹھ گئے جبکہ فیکا آگے گاؤں کی طرف بڑھ گیا۔

فیکے کے جانے کے بعد شیدے نے دوبارہ رانو کے ساتھ ہاتھا پائی شروع کر دی جس پر رانو نے پھر سخت مزاحمت کی اور شیدے کو نزدیک نہ آنے دیا۔ اب ہمیں رانو پر غصہ آنے لگا کہ یہ کیا چاہتی ہے، اور شیدے پر اس سے زیادہ کہ زنخا ہے، زبردستی کیوں نہیں کر لیتا۔ بہر حال ہمارا تجسس اور حیرانی بڑھ گئی تھی۔ شیدا اور رانو سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد (جس دوران مجھے اور علوی کو بہت کوفت ہوتی رہی کہ ناحق پیچھا کیا) فیکا واپس آ گیا اور ہم یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا، جسے ہم نہ پہچان پائے۔ بہر حال ہم سکون سے دیکھتے رہے کہ رانو (جس نے پگڑی اب اتار دی تھی اور اسے شیدے نے سر پر باندھ لیا تھا) اور وہ نیا آدمی قریب کے خشک نالے میں چلے گئے۔ شیدا اور فیکا باہر ہی بیٹھے رہے۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد وہ دونوں باہر آ گئے اور نیا شخص اپنے گاؤں کو مڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیدے نے رانو کو پکڑ لیا، مگر اب اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اور شیدے کے بعد فیکا؟ میں اور علوی اپنے گھر کی طرف چلے آئے لیکن سارا رستہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ اجنبی آدمی کون تھا۔ بہت غور کیا لیکن ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ پوچھ ہم نہیں سکتے تھے کہ وہ دونوں گاؤں کے چودھریوں میں سے تھے۔

مولوی کی کرامت

ویسے تو مولوی عبدالرحمٰن کے قصبے میں قدم رکھنے کے تیسرے دن بعد ہی یہ بات کھل گئی تھی کہ مولوی صاحب جلالی آدمی ہیں۔ تحصیلدار کے لڑکے کو پڑھاتے ہوئے ایسے زور کا تھپڑ مارا کہ بیچارے کا کان پھٹ گیا، جس پر تحصیلدار کا بیس ہزار خرچ آیا، اور جب اس نے مولوی صاحب سے شکوہ کیا تو غریب کے سر پر عصا دے مارا۔ ایک بڑا ہنگامہ کھڑا ہونے لگا مگر اہلِ قصبہ نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لیکن اس بات کی خبر تو بعد میں ہوئی کہ حضرت صاحب صاحب کرامت بھی ہیں۔

پہلا واقعہ تو حاجی امانت کو پیش آیا جس کی حویلی مسجد کے پچھواڑے میں تھی۔ حویلی کے ایک حصے میں بھینسوں کا باڑا تھا جو کپاس کی سوکھی چھڑیوں سے باڑھ کر کے گھیرا گیا تھا۔ مولوی صاحب کے لیے روزانہ ایک کلو دودھ حاجی امانت کے ہاں سے جاتا۔ ایک روز حاجی صاحب کی بیٹی اپنے بچوں کے ساتھ ملنے آئی اور دو دن تک رہی۔ ان دو دنوں میں مولانا کو دودھ نہ گیا۔ شاگرد کو بھیجا تو وہ نامراد لوٹا۔ اب جو مولوی عبدالرحمٰن کو غصہ آیا تو منہ سے بددعا نکل گئی۔ کہنے لگے، ''حاجی کے باڑے کو آگ لگ گئی تو پھر بیٹی دودھ کہاں سے پیے گی؟'' بس اُسی رات باڑے کو آگ نے لپک لیا۔ آگ اس تیزی سے پھیلی کہ بجھائے نہ بجھی اور حاجی کی چار بھینسیں جل مریں۔ اس واقعے نے بہت سے لوگوں کو مولوی کی ولایت کا یقین کروا دیا، سوائے رضا علی کے، کہ وہ ہر معاملے میں شکی واقع ہوا تھا۔ اُس نے یہ شوشہ چھوڑا کہ یہ مولوی صاحب کے کسی شاگرد کی کارستانی ہے۔ مگر جب لوگوں نے اس کا منہ پھنکارا تو وہ بے شرمی سے چپ ہو گیا۔

ابھی اس واقعے کو دو ہی مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک اور غضب ہو گیا۔ جلال بخش کا چھوکرا پتنگ کے پیچھے دوڑتا آیا اور روا روی میں مولوی عبدالرحمٰن کے مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اب ظاہر ہے، مولوی صاحب کے گھر والے سخت پردے دار تھے۔ لونڈے کو چھت پر یوں دندناتے دیکھا تو مولویانی صاحبہ دوہتھڑ پیٹنے لگی۔ ''ہائے یہ کون کم بخت ہماری بے آبروئی پر آمادہ ہے!'' مولوی صاحب نے آواز سنی تو کمرے سے صحن میں دوڑے۔ جونہی لڑکے کو چھت پر دیکھا تو تلووں میں جلن اور غصے سے جسم کانپنے لگا۔ عصا تھامے سیڑھیاں چڑھتے گئے۔ اُدھر بے حیا نے جلدی سے کنکوا پکڑا اور اگلی چھت پر کود گیا۔ اب حضرت صاحب کا غصہ دو چند ہو گیا کہ ایک تو گھر والی بے پردہ ہوئی اور مجرم بھی صاف بچ نکلا۔ بے چارگی کے عالم میں بلند آواز میں بددعائیں دینے لگے، ''خدا کرے تیری ٹانگ ٹوٹے! او نامراد، تیری آنکھیں پھوٹیں! تو ہمیں بے آبرو کرنے نکلا، خدا تجھے بستر پر دراز کرے!''

لڑکا ایک کے بعد ایک چھت پھلانگتا گیا اور مولوی صاحب گالیاں دیتے گئے، کہ اچانک ایک دیوار پر لونڈے کا پاؤں توازن کھو گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ گرتے ہی بائیں ٹانگ سے چٹاخ کی آواز آئی۔ مولوی صاحب نے برے کو انجام تک پہنچتے دیکھا تو خوش ہو کر خضاب شدہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور نیچے اُتر کر **بخاری شریف** کے ''باب الغسل'' کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اب تو پورے محلے میں مولوی صاحب کی کرامات کی دھاک بیٹھ گئی۔ ہر فرد توبہ توبہ بول اٹھا۔ بہت لوگوں نے لڑکے کو مزید کوسنے دیے کہ کیوں اس نے ایک اللہ والے کے گھر نظر ڈالی۔

بہر حال، ان چھوٹے موٹے واقعات سے پچھلے دو برسوں میں مولوی عبدالرحمٰن نے قصبے والوں پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کوئی عام مولوی نہیں ہے، جسے کمی خیال کر لیا جائے۔ وہ جان گیا تھا کہ صراطِ مستقیم پر ہونے کی وجہ سے خدا نے ہمیشہ اس کا پورا پورا ساتھ دیا، حتیٰ کہ فخر کی شادی پر تو مولوی صاحب کی ولایت پر مہر لگ گئی۔ ہر شخص سہم گیا۔ بعض تو انھیں دیکھ کر راستہ بدل لیتے، جبکہ پاس سے گزرنے والا ہر آدمی جھک کر سلام کیے بغیر نہ نکلتا، مبادا مولوی صاحب ناراض ہو کر بددعا داغ دیں۔ اگرچہ فخر کی سزا سخت تھی، مولوی صاحب کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا، لیکن اگر دیکھا جائے تو مولانا حق بجانب تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ پچھلے دس دن سے اس شادی کے ہنگامے نے پورے محلے کی نیندیں حرام کر دیں، روز کی آتش بازی اور ڈھول تاشوں کے شور نے مُردوں تک کے کان نوچ ڈالے۔ اور تو اور، جمعہ کا خطبہ بھی نہ خود سنا اور نہ کسی کو سننے دیا۔ بس یہی بات تھی جو مولوی عبدالرحمٰن کی رنجیدگی کا باعث ہوئی اور دورانِ خطبہ اُن کے منہ سے نکل گیا، ''ڈھول بند نہ کرنا، دلہن چاہے رستے میں ہی بیوہ ہو جائے!'' بس، یہ کہنا تھا کہ ہر طرف سراسیمگی چھا گئی۔ اب کس کی جرأت تھی جو مولوی صاحب سے رحم کی اپیل کرتا۔ تیسرے دن برات گئی اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ واپسی پر دولہے کی کار کو ٹرک نے کچل دیا۔ فخر خاں اور ڈرائیور کی ایک ساتھ ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور دلہن چھ ماہ تک ہسپتال کے بیڈ سے لگ گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مولوی صاحب نے بقول اُن کے اپنی بددعا میں تخفیف کر دی تھی، اس لیے ان کی جان بچ گئی۔

لیکن ایک بات جو پورے قصبے کے لیے حیرانی کا سبب تھی، وہ یہ کہ مولانا صاحب کی دعا کبھی قبول نہ ہوتی، بلکہ بعض اوقات تو اُلٹا اثر دکھاتی۔ رانا فاروق نے نمازِ فجر کے بعد مولوی صاحب سے استدعا کی کہ اس کے والد کے لیے دعائے صحت کر دیں۔ رانا فاروق صاحبِ ثروت آدمی تھا، مولوی عبدالرحمٰن نے جو گڑگڑا کر دعا مانگنا شروع کی تو آدھ گھنٹے تک کھینچ کر لے گئے، اور ابھی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ رانا کا چھوٹا بھائی ابا کی موت کی خبر لے کر مسجد میں پہنچ گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ اہلِ قصبہ کے کہنے پر مولانا نے بارش کے لیے دعا کی، مگر ایسا سوکھا پڑا کہ خلقِ خدا تراہ تراہ پکار اٹھی۔

خیر، یہ کوئی ایسے واقعات نہیں تھے جو مولوی عبدالرحمٰن کے لیے کسی خرابی کا باعث بنتے اور قصبے والوں کو بدگمان کرتے۔ ویسے بھی قصبے کی زیادہ آبادی نظریاتی سطح پر مولانا کی موافق تھی۔ اس کے علاوہ ایک دو تنظیموں کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا علم بھی قصبے والوں کو خوب تھا۔ قربانی کی کھالیں اور سالانہ چندے مولوی صاحب اُن کے لیے اکٹھا کرتے تھے۔ ایک دو لوگوں نے ایک دفعہ چندہ نہ دے کر کفر کا ارتکاب بھی کیا، مگر جلد ہی تنظیموں کے زورِ بازو اور مولانا کی نصیحت نے انھیں صراطِ مستقیم پر دوبارہ لا کھڑا کیا۔

خیر، اسی طرح مولانا نے پورے قصبے کو تین سال کے اندر صحیح دین کی تبلیغ کی۔ نماز کے فوائد، جہاد کی فضیلت اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی کا تمام فلسفہ سمجھا دیا۔ یوں قصبے والے اور مولوی صاحب آپس میں شیر و شکر ہو گئے اور زندگی آرام سے کٹنے لگی، کہ ایک چھوٹے سے واقعے نے مولوی صاحب کی سانس اُکھیڑ کر رکھ دی۔

ہوا یہ کہ وہی رانا فاروق جس کے باپ کی دعائے صحت مولانا صاحب نے کی تھی، اس کا گھر عین مولانا کے سامنے واقع تھا۔ کچھ دن پہلے کم بخت نہ جانے کہاں سے ایک بُل ٹیریا کتا اٹھا لایا جس نے آتے جاتے مولوی عبدالرحمٰن پر بھونکنا شروع کر دیا۔ اِدھر مولوی صاحب میں کچھ عرصے سے وضعداری پیدا ہو چلی تھی۔ کیونکہ مولوی صاحب کے گھر کا تمام خرچ یہی رانا فاروق صاحب اٹھاتے تھے، لہٰذا کتے کو کچھ کہتے ہوئے حیا مانع ہوتی۔ بہت دن تک صبر کیا لیکن کتے کی بدمعاشیاں دن بدن بڑھتی چلی گئیں۔ اب بھونکنے کے ساتھ ساتھ وہ نامراد مولوی صاحب کی ٹانگوں سے بھی ٹکرانے لگا اور ان کے اچھے بھلے کپڑے ناپاک کر کے رکھ دیتا۔ انھوں نے کئی دفعہ سختی سے اور کئی دفعہ پیار سے سرزنش بھی کی مگر کتا تھا کہ اپنی دم کی طرح ٹیڑھا؛ سیدھا ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ مولانا صاحب نے ایک دو دفعہ رانا فاروق سے ہلکی سی شکایت بھی کی مگر وہ ہنس کر ٹال گئے، جس پر مولوی صاحب کو اپنے آپ پر شدید غصہ آیا کہ کاش اس نے تین سال تک رانا فاروق کی روٹیاں نہ کھائی ہوتیں، اور دل ہی دل میں ہزار ہا بددعائیں کتے کی موت کے لیے کر دیں۔ ایک دو دفعہ جمعے کے خطبے میں بھی مولوی عبدالرحمٰن نے کتے کی نجاست کے سلسلے میں زوردار تقریر کی اور کہا کہ جس گھر میں یہ ناپاک جانور ہو وہاں فرشتوں کا گزر نہیں ہوتا۔ مگر رانا فاروق پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دو مہینے تک مولوی صاحب مسلسل دل ہی دل میں روزانہ ہر نماز کے بعد بددعائیں کرتے رہے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اُلٹا کتے نے ایک اور کام شروع کر دیا کہ جب بھی مولانا صاحب اذان دینا شروع کرتے، کتا بھونکنا شروع کر دیتا۔ یہ بات پہلے سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی۔ دوسری تشویش مولوی صاحب کو یہ لاحق ہو گئی کہ آخر ان کی بددعائیں کیوں بے اثر جا رہی ہیں؟ ان باتوں کی وجہ سے مولوی صاحب کی طبیعت میں پچھلے کئی دنوں سے ایک چڑچڑاپن پیدا ہو گیا تھا۔ بات بات پر لوگوں کو ڈانٹتے، اور شاگردوں کی تو گویا جان کا عذاب ہو گئے۔ اِدھر کسی سے ایک زیر زبر کی غلطی ہوئی نہیں کہ بیچارے کو اُدھیڑ کے رکھ دیا۔

آج کتے کو مولوی صاحب کے پڑوس میں آئے تین مہینے ہو چکے تھے۔ ان تین مہینوں میں مولوی عبدالرحمٰن کی زندگی کا سارا لطف غارت ہو کر رہ گیا۔ حرام زادے نے ایک جبہ اور دو شلواریں پھاڑیں۔ کپڑے تو گویا روزانہ ہی پلید کرتا تھا۔ جب چاہتا گھر میں گھس آتا۔ کئی برتن ناپاک کیے۔ خیر، یہ سب کچھ تو گوارا تھا مگر یہ کون سی شرافت تھی کہ اُدھر مولانا اذان کو کھڑے ہوئے، اِدھر یہ شیطان بھونکنے لگا۔ صبر کی آخر ایک حد ہوتی ہے، اور آج مولوی صاحب نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر جیسے ہی مولوی عبدالرحمٰن گھر لوٹے، بُل ٹیریا مولانا کی ٹانگوں کی طرف بھونکتا ہوا دوڑا اور دانتوں سے کپڑے کھینچنے لگا۔ آج مولوی صاحب نے بجائے مارنے کے اُسے پچکارا اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں لے گئے۔ مولویانی صاحبہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ آخر مولوی صاحب کو کیا ہوا؟ جانے کتے کو کمرے میں کیوں لے گھسے؟ اِدھر مولوی عبدالرحمٰن نے کتے سمیت اندر گھستے ہی دروازے کو کنڈی چڑھا دی اور لوہے کا نوکدار سریا پکڑ لیا جو کل نظام دین لوہار سے بنوا کر لائے تھے۔ جب بُل ٹیریے نے مولوی کے تیور دیکھے تو وہ بھونکتا ہوا اِدھر اُدھر کونوں میں دوڑنے لگا؛ لیکن اب حضرت صاحب بھی اپنی آئی پر آئے ہوئے تھے، کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ اندر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور کمرے کی چیزیں ٹوٹنے پھوٹنے لگیں۔ اسی دوڑ دھڑ پے اور آپا دھاپی میں کتے کو ایک سریا جا لگا اور اس کی ٹانگ سے خون نکلنے لگا۔ کتا ہر ممکن جان بچانے کی فکر میں تھا لیکن بھاگنے کو کوئی رستہ نہیں مل رہا تھا اور موت آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ دوسری طرف مولویانی صاحبہ باہر کھڑی دروازہ پیٹنے لگی۔ محلے والے شور تو سن رہے تھے مگر گھر میں داخل ہونے کی جرأت کسی میں نہیں تھی کیونکہ پردہ بہت سخت تھا۔

ادھر اندر جب کتا نڈھال ہو چلا اور اسے اپنی موت نظر آنے لگی تو کمبخت نے ایک عجیب کام کیا۔ ایک بھرپور چھلانگ لگا کر سیدھا مولوی صاحب کی شہ رگ پر حملہ کر دیا۔ مولوی نے فوراً اپنا بایاں ہاتھ کتے اور اپنی گردن کے درمیان کر دیا۔ یوں کتے نے اپنے دانت مولوی صاحب کی بائیں کلائی میں گاڑ دیے۔ درد کی شدت سے ایک دم مولوی کی چیخ نکلی لیکن پھر فوراً ہی دائیں ہاتھ سے کتے کی کمر پکڑ کر مولوی عبدالرحمٰن نے اپنے دانت کتے کی گردن میں پیوست کر دیے۔

یوں مولوی اور کتا پنجوں اور منہ، دونوں طرف سے مصروف ہو گئے اور کمرے میں ایک دم گہری خاموشی چھا گئی۔ باہر مولویانی صاحبہ نے جب اس طرح اچانک خموشی دیکھی تو مزید فکرمند ہوئیں کیونکہ اگر کتا مر گیا تھا تو مولوی صاحب کو دروازہ کھول دینا چاہیے تھا۔ جب خموشی نے طول کھینچا اور دروازہ بھی نہ کھلا تو بیچاری نے دوہتھڑ سے دروازہ کوٹنا شروع کر دیا اور شور مچا کر لوگوں کو پکارنے لگی۔ مولویانی صاحبہ کی پکار پر باہر کھڑا مجمع سیلاب کی طرح اندر آ گیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ دروازے کے دوسری طرف مولوی عبدالرحمٰن کتے کے ساتھ بری طرح الجھا ہوا تھا، کیونکہ اس کی بائیں کلائی کتے کے منہ میں تھی جب کہ دائیں ہاتھ سے مولوی صاحب نے کتے کو پکڑ رکھا تھا اور اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ رکھے تھے، لہٰذا نہ تو ہاتھوں سے دروازہ کھول سکتے تھے اور نہ منہ سے بول سکتے تھے۔

باہر جب لوگ دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر تھک گئے تو انھوں نے دروازہ توڑ دیا۔ دروازہ ٹوٹتے ہی ایک ہولناک منظر سامنے تھا۔ لوگ دم بخود رہ گئے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے آگے بڑھ کر مولوی عبدالرحمٰن اور کتے کو ایک دوسرے سے چھڑایا۔ کتا اور مولوی صاحب ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد نڈھال ہو کر گر پڑے۔ مولانا کی کلائی اور کتے کی گردن سے خون جاری تھا۔ رانا فاروق نے جلدی سے اپنا کتا اٹھایا اور اسے اینمل ہاسپٹل لے گیا۔ اِدھر مولانا کی کلائی پر مرہم پٹی ہونے لگی۔

حادثے کے چوتھے دن جب رانا فاروق کے کتے کے مرنے کی خبر پھیلی تو قصبے میں ایک عجیب قسم کا خوف پھیل گیا۔ گلی گلی میں مولوی صاحب کی جلالت اور اَنانیت کے تذکرے ہونے لگے۔ آؤ بھگت دو چند ہو گئی اور ایسی دھاک بیٹھی کہ پھر قصبے میں کوئی فرد مولوی عبدالرحمٰن سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کے قابل نہ رہا۔